توحید کیا ہے؟

بلال عبد الحی حسنی ندوی

ناشر
سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ - مئی ۲۰۱۸ء

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی

دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

نام کتاب : توحید کیا ہے؟

مصنف : بلال عبدالحی حسنی ندوی

مرتب : محمد ارمغان بدایونی ندوی

صفحات : ۱۶۰

قیمت : Rs.100

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبة الشباب، ندوہ روڈ لکھنؤ

☆ مکتبہ اسلام، گوائن روڈ، لکھنؤ

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

منہج دعوت

عبد اور معبود کے حقوق

نجوم پرستی کی نفی

تین جاہلی تصورات

نحوست کا تصور

توحید کا مطلوبہ تصور

توحید کا اعلیٰ معیار

مظاہر شرک سے اجتناب

مسجود حقیقی

اللہ کی شان عالی

اصلاح کا نبوی انداز

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی

عبد اور غلام کا فرق

قسم کیسے کھائیں؟

اتباع سنت کا جذبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے کاموں میں اللہ نے بڑی برکت عطا فرمائی، ان کی زندگی میں تو سوائے دو ایک مختصر رسائل کے کچھ نہ چھپ سکا، مگر یہ ان کا اخلاص تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی سب تصنیفات منظر عام پر آئیں، جو نامکمل رہ گئی تھیں وہ بھی تکمیل کے مراحل سے گذر کر شائع ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

''تلخیص الاخبار'' کے نام سے جو مجموعہ حدیث مولانا نے جمع کیا تھا، اس کو ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے مولانا کے قابل فخر فرزند مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے شائع کیا، وہ کتاب ہندوستان سے بار بار چھپی، عالم عربی سے بھی بار بار شائع ہوئی اور داخل نصاب کی گئی۔

''تہذیب الاخلاق'' کی شروحات بھی لکھی گئیں اور شائع ہوئیں، خود صاحب کتاب کی نا تمام شرح ''منتہی الافکار'' کے نام سے کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ تھی، وہ بھی الحمدللہ سید احمد شہید اکیڈمی نے تحقیق و تکمیل کے بعد شائع کی، کتاب کا ترجمہ بھی چھپا اور عام ہوا۔

رمضان المبارک میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے اس کے درس کا

سلسلہ برادر معظم حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا تھا، جو تیس سال سے زائد جاری رہا اور برادر صاحب مرحوم سال وفات تک درس دیتے رہے، جو مفید اور مؤثر ہوتا تھا، اس درس کے مختلف ابواب بھی الحمد للہ ضبط تحریر میں لائے گئے اور شائع ہوئے، بھائی صاحب کی وفات کے بعد اس درس کی ذمہ داری جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے اس گنہ گار کے سپرد کی، اس کا سلسلہ الحمد للہ چل رہا ہے۔

''محبت کیا ہے؟'' کے عنوان سے ایک باب اس کا بھی شائع ہوا، پیام عرفات کے صفحات میں ''توحید'' کا باب شروع کیا گیا تھا، جو الحمد للہ مکمل ہوا اور اب وہ بھی کتابی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ ساری محنت ہمارے عزیز و محبّ مولوی محمد ارمغان بدایونی ندوی نے کی، جن کی کوشش سے نہ جانے کتنی کتابیں اور رسائل شائع ہو کر مقبول ہوئے، اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کے کاموں میں مزید برکت عطا فرمائے اور ان کو صحت و عافیت سے رکھے اور اس مجموعہ درس کو بھی مقبول فرمائے، جو ''توحید کیا ہے؟'' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دار عرفات، رائے بریلی

۲۲/شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توحید کیا ہے؟

''توحید'' کے اصطلاحی معنی ہیں: ''خالص ایک ذات کو ماننا''، اور یہ ذات صرف اللہ کی ذات ہے جس کا کوئی شریک نہیں، یہی دین کی اصل بنیاد ہے، نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کو ایک اللہ سے جوڑا جائے، اور مرورِ ایام کے نتیجہ میں توحید کے اندر جو شگاف پڑ گئے ہیں ان کو پر کیا جائے، صحیح عقیدۂ توحید لوگوں کے اندر بٹھایا جائے، کیونکہ توحید کے خالص عقیدہ میں کسی بھی قسم کی کمزوری دین کو کمزور کر دیتی ہے۔

بعثت سے قبل مشرکین مکہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے یہاں بھی کسی حد تک توحید کی رمق باقی تھی، مگر ان کے عقائد میں بہت زیادہ کمزوری پیدا ہوجانے اور شرک میں مبتلا ہوجانے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کو مبعوث کیا گیا، تاکہ آپ تمام انسانیت کو خالص توحید کی دعوت دیں، قرآن مجید میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر آپ ان سے پوچھئے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو کس نے پیدا کیا، تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا، گویا وہ ہزار شرک کے باوجود اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ اصل خالق ہے، دنیا میں جو بڑی بڑی چیزیں نظر آرہی ہیں، ان کو اللہ نے پیدا کیا ہے، لیکن اس کے باوجود پھر ان میں یہ شرک پیدا ہوگیا تھا،

وہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے پیدا تو کر دیا لیکن دنیا کا جو یہ نظام چل رہا ہے، یہ اس نے دوسروں کے حوالہ کر دیا ہے، وہ اس میں تصرف رکھتے ہیں، وہ جس طرح چاہیں اس نظام کو چلائیں، لہٰذا ہمیں ان کو راضی کرنا چاہیے، کیونکہ جب تک ہم ان لوگوں کو راضی نہیں کریں گے، جن کے ہاتھ میں یہ سارا نظام ہے اس وقت تک ہم اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، گویا ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اب ہمیں اپنی مرادیں، ضرورتیں انہیں کے سامنے رکھنی چاہئیں، انہیں سے دعائیں کرنی چاہئیں، ہماری تمنائیں انہیں کے سامنے سر جھکانے سے پوری ہوں گی۔

زمانۂ جاہلیت میں ایک اللہ کی ذات کو ماننے کے ساتھ شرک کی جو مختلف شکلیں لوگوں نے اختیار کر لی تھیں، ان میں دو شکلیں بہت عام تھیں، جن کو علمائے اہل سنت والجماعت ''شرک فی الالوہیت'' اور ''شرک فی الصفات'' سے تعبیر کرتے ہیں، عام طور پر شرک کی یہی دو قسمیں ہر دور میں زیادہ رائج رہی ہیں، البتہ ''ربوبیت'' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایک ماننے کے عقیدہ کے تقریباً سب قائل رہے ہیں، سب یہ سمجھتے ہیں کہ اصل طاقت ایک ہے، وہی پیدا کرنے والا اور موت دینے والا ہے، اگر اس دور کے مشرکین سے بھی معلوم کیا جائے تو وہ بھی یہی بات کہتے ہیں کہ اصل بڑی طاقت ایک پرمیشور ہی کی طاقت ہے، اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، جب کہ ہندوستان میں برادران وطن کے متعلق یہ مثل مشہور ہے کہ ''جتنے کنکر اتنے شنکر''، یعنی یہاں کے لوگوں کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ہر پتھر اور ہر نافع وضار چیز کو پوجنے والے ہیں، اگر کسی جانور سے نفع پہنچ رہا ہے تو وہ بھی ان کے یہاں معبود ہے، اور اگر نقصان پہنچ رہا ہے تب بھی معبود جیسا کہ سانپ جو کہ کاٹنے والا جانور ہے، مگر اس نقصان پہنچانے والے جانور کی بھی پرستش کی جاتی ہے، لیکن اس سب کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک خدا کی ذات کو بھی تسلیم کرتے ہیں، البتہ اس تک پہنچنے کے لیے اپنی دیوی دیوتاؤں کو وسیلہ ضروری سمجھتے ہیں، قرآن مجید میں قرب الٰہی کے حصول کی خاطر اسی

وسیلہ پر نکیر کرتے ہوئے صراحت سے فرما دیا گیا:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (الزمر: ٣)

(اور جن لوگوں نے اس کے علاوہ کارساز بنا رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم ان کی بندگی اس لیے کرتے ہیں تا کہ یہ ہمیں اللہ سے مرتبہ میں قریب کر دیں، ان کے درمیان اللہ تعالیٰ ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں جھگڑتے ہیں، یقیناً اللہ ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا ہو، انکار ہی اس کا شیوہ ہو)

معلوم ہوا کہ ربوبیت کا عقیدہ کسی حد تک ہر دور میں باقی رہا ہے، مگر خالص توحید کے باب میں شرک در آنے کا اصل مسئلہ ان دو شکلوں میں بہت زیادہ پیش آیا ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا، ذیل میں انہیں کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے:

شرک فی الالوہیت

یہ شرک کی وہ قسم ہے جو کسی نہ کسی شکل میں ہر زمانہ میں رائج رہی ہے، اس سے مراد مشرکین کا وہ عقیدہ ہے، جس میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز کا اصل خالق اللہ تعالیٰ ہے، البتہ اس نے اپنے اختیارات وتصرفات دوسروں کے سپرد کر دیئے ہیں، اس لیے اب ہمیں ان کو راضی کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ہماری ضروریات انہیں سے وابستہ ہیں، اس خودساختہ عقیدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو اعمال عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کئے جانے چاہئیں، وہ اعمال ان دیوی دیوتاؤں یا اللہ کے بعض نیک بندوں کے ساتھ شروع ہو گئے جن کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا کہ اللہ نے ان کو سارے اختیارات دے دیئے، اب وہ جو چاہیں کریں۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد شرک کی انہیں تمام اقسام کو ختم کرنا تھا، لوگوں کے ذہنوں میں توحید کا صحیح تصور قائم کرنا تھا، ہر ایک کو یہ دعوت دینا تھا کہ اصل ذات اللہ کی ذات ہے، وہی ہر ایک کا خالق و مالک ہے، اور وہی پوری دنیا کو چلا رہا ہے، اس کے اس نظام میں اس کا کوئی شریک نہیں، نہ ہی اس نے اس نظام کو چلانے کی ذمہ داری کسی کے سپرد کی ہے، اسی لیے مختلف آیات میں صراحت سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ تمام اعمال عبادت صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہی روا ہیں، اعمال عبادت میں سے کوئی ایک عمل یا اس کا بعض حصہ بھی کسی دوسرے کے لیے کرنا سخت گناہ کی بات ہے، کسی کے آگے سجدہ کرنا، کسی کے آگے تعظیماً اس طرح کھڑا ہونا جیسا کہ نماز میں کھڑا ہوا جاتا ہے، کسی کے لیے نذر ماننا، کسی جگہ کو اس طرح مقدس سمجھنا جس طرح حرم پاک کو مقدس سمجھا جاتا ہے کہ جیسے وہاں حالت احرام میں شکار کرنا بھی جائز نہیں، حرم کے تمام آداب کی رعایت کرنا نہایت ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح کسی مزار کے آس پاس کی جگہ یا کسی بزرگ کی خانقاہ یا ان کی رہائش گاہ وغیرہ کے سامنے انہیں آداب کو بجالانا جو صرف شعائر اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں، یہ تمام چیزیں شرک میں داخل ہیں، شریعت اسلامیہ میں ان تمام چیزوں پر سختی سے نکیر کی گئی ہے، نبی اکرم ﷺ نے تمام عمر ان چیزوں کی بیخ کنی فرمائی، قرآن مجید میں تمام اعمال عبادت کو صرف اللہ کے لیے اسی مقصد کے تحت جائز کیا گیا کہ تمام اعمال عبادت انتہائی درجہ کی تعظیم و محبت سے تعلق رکھتے ہیں، اور انتہائی تعظیم و محبت سوائے اللہ کے کسی کے لیے جائز نہیں، محبت کے متعدد درجات ہیں، ابتداء میں میلان ہوتا ہے، پھر رغبت، اس کے بعد چاہت اور اس کے بعد آخری درجہ کی وہ محبت جس کے نتیجہ انسان بس اپنے محبوب کے سامنے جھکنا چاہتا ہے، اور جھکنا سوائے اللہ کے کسی کے سامنے جائز نہیں، اس لیے محبت کا اصل محور بھی سوائے اللہ کے کوئی اور بنانا درست نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے محبت الٰہی کو اہل ایمان کی شناخت بتایا، ارشاد ہوا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللّهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّهِ وَالَّذِينَ آمَنُواْ أَشَدُّ حُبّاً لِّلّهِ﴾ (البقرة: ١٦٥)

(اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ اوروں کو (اللہ کے) برابر ٹھہراتے ہیں، ان سے اسی طرح محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت ہو اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے ہیں)

معلوم ہوا کہ تمام اعمال عبادت جو انتہائی درجہ کی تعظیم ومحبت سے تعلق رکھتے ہیں، اصل خالق و مالک کو چھوڑ کر کسی کے لیے جائز نہیں، یہ انتہائی تعظیم صرف اسی ذات کے لیے روا ہے، کسی کے سامنے تعظیماً کھڑا ہونا، سجدہ کرنا، کسی کے لیے نذر ماننا، غرض کہ اس جیسے تمام اعمال کسی دوسرے کے لیے کرنا ہرگز جائز نہیں، زمانہ جاہلیت میں شرک کی یہی قسم رائج تھی، ان کے یہاں الوہیت میں شرک داخل تھا، عبادت کے جو طریقے خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں، انہوں نے ان طریقوں کو دوسروں کے لیے اختیار کر رکھا تھا۔

شرک فی الالوہیت کا آغاز

شرک فی الالوہیت کی ابتداء کے متعلق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں بڑے بڑے اولیاء اللہ جو حضرت نوح علیہ السلام کے متبعین یا ان کے بعد والے لوگ تھے، اور وہ بڑے ہی عبادت گذار، توحید پرست اور اللہ کے برگزیدہ بندے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد اور ان کے ماننے والوں نے سوچا کہ جہاں وہ عبادت کرتے تھے وہ جگہ بڑی مقدس ہے، ہمیں بھی وہیں عبادت کرنی چاہیے، پھر رفتہ رفتہ ان خاص جگہوں کی تعظیم میں اس حد تک غلو ہو گیا کہ ان کی آئندہ آنے والی نسلیں خدا کی عبادت چھوڑ کر انہیں مقدس جگہوں کو لائق عبادت سمجھنے لگیں، تعظیم ومحبت کے جو اعمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے درست تھے وہ ان پتھروں کے ساتھ شروع ہو گئے، اور

اس کے بعد یہ تصور بھی عام ہو گیا کہ مالک حقیقی نے اپنی طاقت ان تمام مصنوعی شکلوں میں منتقل فرمادی ہے، لہٰذا اب ہمیں انہیں کی تعظیم کرنی چاہیے اور ان ہی کی عبادت کرنی چاہیے، یہاں سے شرک کا سلسلہ شروع ہوا۔

شرک کی ابتداء کے متعلق یہ بھی آتا ہے کہ جب اللہ کے برگزیدہ بندے اس دنیا سے رخصت ہو گئے، تو ان کی اولاد کو شیطان نے ان نیک لوگوں کے مجسمے تراشنے پر آمادہ کیا، چنانچہ یہ لوگ اپنے مرنے والے بزرگ کا مجسمہ تراشتے اور ہر روز ان مجسموں کے پاس جاتے، ان کو دیکھ کر اپنا دل خوش کرتے، ان سے دلوں کی تسلی کا سامان کرتے، پھر رفتہ رفتہ وہی قصہ ہوا کہ بعد کی نسلوں نے اپنے آباء واجداد کو ان مجسموں کی تعظیم کرتے پایا، اس لیے وہ انہیں مجسموں کو لائق تعظیم سمجھ بیٹھے، انہیں کو اپنا معبود تسلیم کر لیا، اور ہر گھر میں اپنے خاندان کے بڑوں کے مجسمے بنا کر انہیں کی پرستش شروع کر دی، اور اس طرح دنیا بھر میں بت پرستی کا مزاج عام ہوتا گیا، لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جس طرح دنیوی نظام میں سفارشیوں کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور میں بھی اس کے برگزیدہ بندوں کو سفارشی بنانا ضروری ہے، قرآن مجید میں اسی غلط تصور کی حقیقت واضح کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ جب میرا کوئی بندہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اس کے بہت قریب ہوتا ہوں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة: ۱۸۶)

(اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں ہر پکارنے والے کی پکار میں سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے)

گویا اس آیت سے یہ بات کھل گئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تک براہ راست پہنچنے

کے بجائے کسی کو وسیلہ بنانا بے ضرورت ہے، ایسا تصور رکھنا بھی مشرکانہ اور غلط عقیدہ کے مرادف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بندہ سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، ہر بندہ کی ضروریات کو اس سے زیادہ سمجھنے والا ہے، لہٰذا بندہ کو جو بھی مانگنا ہو وہ اپنے رب سے براہ راست مانگے، اسی لیے ایک حدیث میں یہاں تک فرمادیا گیا کہ اگر تمہیں اپنے جوتے کا تسمہ بھی مانگنا ہے تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سے مانگو، گویا اس سے یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ ہر بندہ کو اپنی چھوٹی بڑی تمام ضروریات اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی رکھنی چاہئیں، یہ یقین رکھنا چاہیے کہ تمام ضروریات پوری کرنے والی ذات اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

اسلام کا اعلان

بعثت نبوی ﷺ سے قبل شرک کی مذکورہ قسم یعنی ''شرک فی الالوہیت'' دنیا بھر میں عام تھی، آپ ﷺ نے اول دن سے اس کی کھل کر مخالفت فرمائی، عقیدۂ توحید کے سلسلہ میں ادنیٰ قسم کی بھی مداہنت گوارہ نہ کی، سخت سے سخت حالات میں بھی عقیدۂ توحید کے باب میں ایک لمحہ کے لیے بھی کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ کرنا پسند نہ فرمایا، بعض دفعہ مشرکین مکہ نے یہ پیش کش رکھی کہ تم ہمارے ان معبودوں کو مان لو، ہم تمہیں اذیتیں دینا چھوڑ دیں گے، اس پر آپ ﷺ کی زبانی قرآن مجید میں صاف صاف فرمادیا گیا:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ☆لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ☆وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ☆وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ☆وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ☆ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ (الکافرون: ۱-٦)

(کہہ دیجیے اے انکار کرنے والو، میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں، اور نہ مجھے اس کی عبادت کرنی ہے جس کی عبادت تم کرتے رہے ہو، اور نہ تمہیں اس کی عبادت کرنی ہے جس کی عبادت

میں کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین)
معلوم ہوا دین اسلام میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کی الوہیت وصفات میں کسی دوسرے کو شریک کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں، اگر ہوتی تو مکی دور جو سخت آزمائشوں کا دور رہا ہے، شاید اس میں کچھ افہام وتفہیم سے کام لیا جاتا، لیکن خالص عقیدۂ توحید کے سلسلہ میں اسلام ایسی کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتا، افسوس کی بات ہے کہ عقیدۂ توحید کے باب میں ایسی سخت تعلیمات کے باوجود مسلمانوں کے ہی نام سے بعض ایسے فرقے بھی پائے جاتے ہیں جو شرک فی الالوہیت کو درست سمجھتے ہیں، بزرگوں یا ان کی قبروں کو وہ مقام دیتے ہیں جو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، ان کے ساتھ انتہائی درجہ کی تعظیم ومحبت کی وہی تمام شکلیں اختیار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں، واقعہ یہ ہے کہ تعظیم ومحبت کی یہ شکلیں انسان کو شرک تک پہنچاتی ہیں، اور انسان شرک فی الالوہیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

شرک فی الصفات

انسانی سماج میں شرک کی یہ قسم بھی ہر دور میں رائج رہی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو صفات اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں، اس کی ان صفات میں دوسروں کو بھی شریک ماننا، اس میں دو چیزیں زیادہ اہم ہیں: ایک ''قدرت'' دوسرے ''علم''، یہ دو ایسی اہم صفات ہیں کہ عموماً آدمی ان خصوصیات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیروں کو شریک کر لیتا ہے اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
قدرت اور علم دونوں صفات اپنے کمال کے ساتھ صرف اللہ کے پاس ہیں، دنیا میں ایسا کوئی نہیں جس کو ہر چیز کا علم ہو، ہر راز سے واقف صرف وہی ایک ذات ہے، ہر چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، آج اس عقیدہ میں بھی مسلمانوں میں بڑی کمزوری نظر آتی ہے، ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اس عقیدہ میں کتنی

مضبوطی ہونی چاہیے، ہمیں یہ خیال نہیں رہتا کہ ہمارے دین کی اساس اسی عقیدۂ توحید پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد کمزور پڑ جائے گی تو پھر باقی کام بھی کمزور ہوں گے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں نا قابل قبول ٹھہریں گے، کیونکہ یہ عقیدہ شرک کے دروازے کھول دیتا ہے، اور شرک کے ساتھ اللہ کے یہاں کوئی عمل قابل قبول نہیں، لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی کے بارے میں تصرف کا عقیدہ رکھنا، کسی کو قادر مطلق سمجھنا، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے عبادت کی انتہائی شکلیں اختیار کر کے اس کو راضی کرنے کی کوششیں کرنا، کسی اور سے روزی روٹی مانگنا، سر جھکانا، مشکل کشا سمجھنا، یہ سب چیزیں غیر اسلامی ہیں، مگر افسوس کی بات ہے کہ مشرکین کی یہ خصلتیں آج مسلمانوں میں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں، یہ ساری باتیں شرک کی ہیں اور ان سے بچنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

آج ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی موجود ہے جو سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ جو کہ اللہ کے محبوب نبی ہیں، آپ ہی کو مشکل کشا سمجھ بیٹھی ہے، آپ ہی کو تصرف کا حق دار سمجھتی ہے، آپ کے تعلق سے ایسے مشرکانہ خیالات کی حامل ہے، جن کا خالص توحید سے کھلا تضاد نظر آتا ہے، بعض دفعہ ان کے ان خیالات کا اندازہ اسی فکر کے اشعار سے بھی ہوتا ہے، جن میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کرسی پر حضرت محمد ﷺ کو بٹھا دیا اور خود فارغ ہو گیا، اب کائنات میں جو بھی کچھ ہو رہا ہے وہ سب آپ ﷺ کے کرنے سے ہو رہا ہے، (العیاذ باللہ!) توحید کے خلاف اس واضح مشرکانہ عقیدہ کے ساتھ اگر کوئی یہ دعوی کرے کہ وہ حضور ﷺ سے سچی محبت کرنے والا ہے، تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ محبت نہیں بلکہ حقیقی معنی میں دشمنی ہے، آپ ﷺ کی شان مبارک میں سخت توہین ہے، اس لیے کہ محبت و تعظیم کا اصول یہ ہے کہ جس کا جو مقام ہے، اس کو اسی مقام پر رکھا جائے، اگر اس سے آگے یا پیچھے کیا گیا تو یہ اس کی توہین سمجھی جائے گی۔

توحید کا مطالبہ

موجودہ دور میں مشرکین کے عقائد سے ملتے جلتے جو عقائد ونظریات مسلمانوں میں پیدا ہورہے ہیں، ان مشرکانہ عقائد سے گریز کرنے کی سخت ضرورت ہے، یہ یقین راسخ کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات میں کوئی شریک نہیں، نہ اس کی قدرت میں کوئی شریک ہے اور نہ ہی علم میں، اسی کو تمام تصرفات کا حق حاصل ہے، اسی کے پاس تمام چیزوں کا علم ہے، عبادت میں انتہائی درجہ کی تعظیم ومحبت کی تمام شکلیں بھی اسی کے لیے اختیار کرنی چاہئیں، اگر یہ عقیدہ راسخ ہوجائے تو ہماری توحید مکمل ہوگی، اور اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی یا غفلت سے کام لیا جائے تو توحید میں خلل پیدا ہونا یقینی بات ہے، اس سلسلہ میں بہت سے ان لوگوں کو بھی چوکنا رہنا چاہیے جو خاصے دین دار سمجھے جاتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کے یہاں بھی غیر شعوری طور پر توحید میں خلل پیدا ہوجاتا ہے، مثلاً: بزرگان دین کے متعلق بہت سے لوگوں کا یہ تصور کہ وہ جو چاہیں گے کردیں گے، ہم ان کے پاس جاکر دعا کراکے ہر کام کرالیں گے، ان کے فیض سے ہماری مشکلات حل ہوجائیں گی، اگر کسی کے فیض سے مشکلات حل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے تصرف سے مشکل آسان ہوجائے گی تو یہ عقیدہ سراسر غلط عقیدہ ہے، البتہ یہ خیال کرنا کہ فلاں بزرگ کی نیکیوں کی برکت سے بفضل خداوندی ہمارا کام آسان ہوگیا تو پھر بھی غنیمت ہے، مگر یاد رہے کہ کسی کے بارے میں تصرف کا عقیدہ رکھنا توحید خالص سے منھ موڑنا ہے، ہر کسی کو یہی یقین رکھنا چاہیے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت ہوگی تو ہمارا کام ہوگا، ورنہ کسی بزرگ یا ولی کامل کی محض دعاؤں سے کام ہونے والا ہرگز نہیں ہے، اگر اس کی گنجائش ہوتی تو نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ ان لوگوں کو ضرور ہدایت نصیب ہوتی، جن کی ہدایت کے لیے حضور ﷺ دل سے متمنی تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہی فرق واضح کرنے کے لیے صاف طور پر ارشاد فرمادیا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾

(القصص: ٥٦)

(آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، ہاں اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)

معلوم ہوا کہ ہدایت دینا اللہ کا کام ہے، آپ کا کام جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا ہے، حقیقی متصرف وہی ذات ہے، وہی قادر مطلق ہے، اسی کے ہاتھ میں کسی کی تقدیر کو اچھا یا برا کرنا ہے، اسی کے ہاتھ میں موت وحیات ہے، گویا اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ہدایت دے دینا صرف اللہ کا کام ہے، نبی اکرم ﷺ کا کام صرف راستہ بتانا ہے، تو کسی برزگ یا ولی کامل کے لیے ایسا عقیدہ رکھنا کہ وہ جو چاہیں کرلیں، کھلا ہوا مشرکانہ عقیدہ ہے۔

مشرکانہ عقائد

افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اولیاء اللہ کے متعلق خالص مشرکانہ عقائد کی حامل ہے، کسی کے بارے میں یہ تصور قائم ہے کہ ملک الموت کسی شیخ کی روح قبض کرنے کے لیے آئے، شیخ روح قبض کئے جانے پر راضی نہ ہوئے، چنانچہ انہوں ملک الموت ہی کو پکڑلیا اور انہیں کی روح قبض کرلی، کسی کے بارے میں یہ تصور قائم ہے کہ ایک مرتبہ ملک الموت روحیں قبض کر کے کسی تھیلے میں لے جارہے تھے، راستہ میں شیخ صاحب کی ملک الموت سے ملاقات ہوئی، تھیلے میں دیکھا تو ایک ایسے صاحب کی روح بھی موجود تھی جو کہ شیخ صاحب کے مرید تھے، چنانچہ انہوں نے اس تھیلے پر ہاتھ مارا اور ساری روحیں آزاد کرالیں، غرض کہ اس طرح کی ہفوات وخرافات کا ایک ایسا سلسلہ چل پڑا ہے جن کے شرک ہونے میں کوئی احتمال باقی نہیں رہ جاتا، اور عقل ونقل سے ان کا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں، عقیدۂ توحید کے مکمل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ شرک کی ان تمام قسموں سے بھی دور رہا جائے، جن سے عقیدۂ توحید کو گھن

لگتا ہو، قرآن مجید میں توحید کے عقیدہ پر خاص توجہ دلائی گئی ہے، ان تمام شکلوں سے محفوظ رہنے کی تاکید کی گئی ہے جن سے عقیدۂ توحید میں کمزوری پیدا ہوتی ہے، اسی لیے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے تھے کہ اگر کوئی انسان قرآن مجید صحیح دل اور صحیح نیت سے سمجھ کر پڑھ لے تو وہ کبھی بھی مشرک نہیں ہوسکتا، البتہ اگر کوئی شخص قرآن مجید بغیر سمجھے یا سمجھنے کی کوشش کئے بغیر ہی پڑھے تو یقیناً ثواب تو ملے گا لیکن پیغام قرآن سے محرومی ہوگی، واقعہ ہے کہ اگر کوئی شخص کھلی آنکھوں سے قرآن مجید کا مطالعہ کرے گا تو مشرک باقی نہیں رہ سکتا، اس لیے کہ قرآن مجید میں شرکیہ اعمال کی تمام شکلیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں اور جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

معبود حقیقی

﴿وَإِلَـهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾

(البقرة: ۱٦۳)

(اور تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے اس رحمٰن و رحیم کے علاوہ کوئی معبود نہیں)

اس آیت میں یہ بات صراحت سے فرمادی گئی کہ تمہارا معبود تنہا صرف ایک ہی معبود ہے، تم کو اسی کی پرستش کرنا ہے، یہاں معبود کے لیے "الٰہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم "تالہ" و "تعبد" ہے، یعنی الوہیت وعبادت کی تمام شکلیں اس کے سوا کسی بھی دیوی دیوتا کے لیے جائز نہیں، جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے عبادت کے اندر دوسروں کو شریک عبادت کرلیا تھا، اصل طاقت کے علاوہ دوسری طاقتوں کو بھی لائق سجدہ سمجھنے لگے تھے، قرآن مجید میں انہیں غلط عقائد پر ضرب لگاتے ہوئے وضاحت سے فرمادیا گیا کہ تالہ وتعبد کی تمام شکلیں سوائے اللہ کے کسی اور کے لیے اختیار کرنا جائز نہیں، تمام انسانوں کا معبود وہی اللہ ہے، وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے، ساری ضرورتیں وہی پوری کرتا ہے، ہر ایک کی دعا سنتا ہے، کبھی مطلوبہ چیز دے دیتا ہے، کبھی اس سے بہتر چیز عنایت فرماتا ہے، ورنہ آخرت میں اس دعا کا بہترین بدل عطا فرماتا ہے، اس رحمٰن ورحیم کو چھوڑ کر انسان کسی دوسرے کے آگے سر جھکائے یہ انتہائی محرومی کی بات ہے۔

صفاتِ الٰہیہ

﴿اللّٰهُ لَا إِلٰـهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾

(البقرة: ۲۵۵)

(وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند)

اس آیت میں مشرکین کے اس عقیدہ کو باطل کر دیا گیا، جس میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا بنائی، کائنات کا سارا نظام بنایا، اور اب اس کی نگرانی دوسروں کے سپرد کر دی، "حَيٌّ و قَيُّوم" کی صفت بیان فرما کر یہ وضاحت ہوگئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب ایسی غیر مناسب باتوں کی نسبت کوئی معنیٰ نہیں رکھتی، اصل نگراں اور زندہ رہنے والی ذات اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ہے، اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، کسی بھی نظام میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا کوئی شریک نہیں، کیونکہ نظام کائنات کو چلانے کے لائق وہی ذات ہو سکتی ہے، جو ہمیشہ کے لیے زندہ ہو، اس کو کبھی فنا نہ ہو، نیند اور اونگھ کا اس کے پاس سے گزر تک نہ ہو، اور ایسی ذات سوائے اللہ کے کوئی نہیں، گویا آیت شریفہ میں "الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ" کی صفات بیان فرما کر ان تمام مشرکانہ عقائد کو رد کر دیا گیا، جن میں یہ بات شامل تھی کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کی تخلیق کے بعد تھک گیا یا اس کو بھی آرام کی ضرورت پڑتی ہے، یا نظام کائنات چلانے میں اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہیں، قرآن مجید کی ان واضح تعلیمات کے بعد کسی کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں کسی کو شریک ٹھہرائے، کسی اور ذات کو کائنات میں تصرف کا حق دار سمجھے، خدا کے سوا کسی دوسرے کو بندگی کے لائق تسلیم کرے۔

حکمت دعوت

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾

(آل عمران: ٦٤)

(آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے (وہ یہ) کہ ہم صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنالے پھر اگر وہ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں)

اہل کتاب کے اندر کسی حد تک توحید تھی، وہ اللہ کو مانتے تھے، اسی کو معبود قرار دیتے تھے، لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے خدا کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک کرلیا تھا، اہل کتاب میں ''توحید'' ایک ایسی صفت تھی جو گویا کہ ان میں اور مسلمانوں میں ایک طرح سے مشترک تھی، لیکن ان کے اندر مکمل توحید نہ تھی، بلکہ ناقص تھی، ان کے اندر توحید کا ایک حصہ پایا جاتا تھا، لیکن بہر حال توحید کا ان کو دعوی تھا، اور کسی نہ کسی درجہ میں ان کے اندر یہ چیز موجود تھی، اس حیثیت سے کہ وہ ایک اللہ کو مانتے تھے، لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے تھے۔

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو دعوت کا ایک طریقہ اور اس کی حکمت بتائی گئی

ہے، آپ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ اعلان فرمادیجئے اور یہ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم تم میں مشترک یعنی برابر ہے، وہ یہ ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں، اور ہم میں سے بعض بعض کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب نہ بنالے، اس کے بعد فرمایا گیا کہ اب بھی اگر وہ نہیں مانتے تو آپ کہہ دیجئے کہ تم گواہ رہنا کہ ہم تو جھکے ہوئے ہیں، یعنی ہم نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردیا۔

اس آیت میں دعوت کی بڑی حکمت بھی بیان کی گئی ہے، جس کو ''کلمہ سواء'' قرار دیا گیا ہے، وہ ایک مشترک بات ہے، گرچہ اس میں مکمل اشتراک نہیں تھا، لیکن کسی نہ کسی درجہ میں اشتراک تھا، اور یہ واقعہ ہے کہ جب آدمی کوئی مشترک بات بیان کرتا ہے، کوئی ایسی بات کہتا ہے جس کو مخاطب بھی تسلیم کرتا ہو اور مانتا ہو تو اس کے لیے اگلی باتوں کا سننا آسان ہوجاتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ کہنے والا جو کہہ رہا ہے وہ کوئی الگ بات نہیں ہے، بلکہ کہنے والا اپنا ہی آدمی ہے، جب ایک مرتبہ اپنائیت کا کسی نہ کسی درجہ میں احساس ہوجائے تو پھر اس کے آگے جو دوسری باتیں کہی جاتی ہیں، وہ بالکل ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالی جاتیں، بلکہ ان پر آدمی غور کرتا ہے کہ یہ شخص پہلے جو بات کہہ رہا تھا، لگ رہا تھا کہ وہ ہماری ہی بات کہہ رہا تھا، لگتا ہے کہ یہ اپنا ہی آدمی ہے، چنانچہ آگے کی باتوں کو سننے کے سلسلہ میں وہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ ہوسکتا ہے بہت سی ایسی باتیں ہوں جو ہمارے نظام سے بھی تعلق رکھتی ہوں، آدمی ان کو بالکل الگ نہیں سمجھتا، گویا یہ جو آیت بیان کی گئی، اس میں ایک طرف توحید کا مکمل بیان ہے، دوسری طرف دعوت کی حکمت بھی ہے، اس میں ''کلمہ سواء'' کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگرچہ وہ اشتراک ناقص تھا، ظاہر ہے کہ ان کے اندر ناقص توحید تھی، اور نبی ﷺ کے ذریعہ جس توحید کی دعوت دی جارہی ہے وہ توحید کامل ہے، اسی لیے اس کو کمال کے ساتھ ہی بیان کیا جارہا ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، لہٰذا صرف اسی کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو

شریک نہ کریں۔

اس آیت میں اللہ کو ماننے کی جو بات کہی جارہی ہے، اس کو اہل کتاب بھی مانتے تھے، لیکن معاملہ یہ تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو پوجتے تھے، دوسروں کی بندگی کرتے تھے، یہودیوں کا حال یہ تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، عیسائیوں کا حال یہ تھا کہ وہ حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، قرآن مجید کی بعض آیتوں میں تو بہت طاقت کے ساتھ عیسائیوں کا رد کیا گیا ہے، اس حد تک وہ شرک میں مبتلا ہوگئے تھے، گویا وہ ان کا ایک طرح کا گورکھ دھندا تھا، وہ کہتے تھے ''تین کا ایک ہے'' اور ''ایک کے تین'' ہیں، گویا ایک طرف وہ یہ چاہتے تھے کہ توحید کا دامن بھی نہ چھوٹے، دوسری طرف چاہتے تھے کہ ان کے شرکیہ عقائد، اعمال بھی باقی رہیں، اور یہ دونوں باتیں ممکن نہ تھا کہ ایک ساتھ جمع ہوجائیں، کیونکہ ان میں بالکل ضد تھی، لیکن انہوں نے ان کو فلسفیانہ انداز سے جوڑا تھا، وہ کہتے تھے کہ اصل ایک ہے لیکن ایک کا تین ہے، اور تین کا وہ ایک ہے، تو یہ جو ان کا شرک کا عقیدہ تھا، قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری جگہوں پر اس کی قلعی کھول دی۔

غرض یہ کہ ان کو توحید کا دعوی تھا، وہ کسی نہ کسی درجہ میں اس بات کو مانتے تھے کہ اللہ کی ایک بڑی طاقت ہے، لیکن یہ بھی تصور رکھتے تھے کہ پھر اس نے اپنا بیٹا بنالیا ہے، ظاہر ہے کہ جب کسی کا کوئی بیٹا ہوتا ہے تو وہ نازنخرے بھی کرتا ہے، وہی تصور ان کا بھی تھا کہ حضرت عیسی جب خدا کے بیٹے ہیں تو ان کو یہ حق ہے کہ وہ منوا بھی لیں گے، جب کوئی بات چاہیں گے تو ان کی چلے گی، وہ جس طرح چاہیں گے کروالیں گے، پھر اس میں بعض فرقوں کے اندر اس قدر تجاوز ہوگیا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اب حکومت حضرت عیسی ہی کی ہے، وہی دنیا چلارہے ہیں، گویا اللہ نے جو (معاذ اللہ) باپ تھا، اس نے حکومت بیٹے کو دے دی، جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے کہ جب باپ کمزور ہوجاتا ہے تو بیٹے کو ساری چیزیں سپرد کردیتا ہے، یہی تصور عیسائیوں کا حضرت عیسی کے متعلق تھا۔

مشرکانہ تصورات

افسوس کی بات ہے کہ آج یہی تصور بہت سے مسلمانوں کے اندر بھی آ گیا، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ گویا اللہ کے بیٹے ہیں، اگرچہ وہ اس بات کو زبان سے نہیں کہتے کہ آپ ﷺ خدا کے بیٹے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ان کا جو تصور ہے وہ اس حد تک ہے کہ گویا وہ آپ ﷺ کو خدائی میں شریک مانتے ہیں، اس طرح عقیدہ اس قدر بگڑ گیا ہے کہ بعض مرتبہ ایسے لوگوں کو مسلمان کہنا مشکل ہے، اس لیے کہ یہ عقیدہ رکھنا کھلا شرک ہے کہ معاذ اللہ! اللہ تبارک وتعالیٰ نے ساری چیزیں آپ ﷺ کے حوالہ کر دیں، اب وہ خود فارغ ہو گیا، اب جو کرنا ہے وہ اللہ کے رسول ﷺ کر لیں گے، اس طرح کی باتیں ان کے اشعار میں بھی موجود ہیں کہ ہمیں اللہ سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے، ہمیں جو لینا ہے وہ محمد ﷺ سے لے لیں گے، ظاہر ہے اس سے بڑا شرک کیا ہوگا کہ اپنی ضرورتوں کو اللہ کے بجائے حضرت محمد ﷺ کے سامنے رکھا جا رہا ہے، گویا آپ کو خدائی کا پوری طرح درجہ دیا جا رہا ہے، حیرت کی بات ہے کہ اس طرح کا شرک آج مسلمانوں کے اندر بھی پیدا ہو گیا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اسی لیے یہ بات کہتے تھے کہ آج حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے قبرستانوں میں خدا جانے کتنے غیر مسلم دفن ہو رہے ہیں، اس لیے کہ ان کا عقیدہ خالص مشرکانہ عقیدہ ہے، کہیں پر ان میں الحاد یعنی انکار خدا پایا جا رہا ہے، تو ایک طرف نام مسلمانوں کے ہیں، دنیا میں ان کو لوگ مسلمان سمجھ رہے ہیں، اور حکومت کی لسٹ میں بھی مسلمان ہیں، لیکن اللہ کے یہاں وہ کیا ہیں اس کا کوئی بھروسہ نہیں، اس لیے کہ مسلمان نام سے نہیں ہوتا، مسلمان جب ہوگا جب وہ اپنے عقیدہ کو اس کے بالکل مطابق کر لے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا بتایا ہوا عقیدہ ہے، آپ ﷺ نے جس کی پوری طرح وضاحت فرمائی ہے، آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کو اس درجہ غیرت تھی کہ برداشت نہیں ہوتا تھا، مشہور قصہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی خطیب نے اپنی

تقریر میں کہا:

"ومن يطع الله و رسوله فقد رشد ومن يعصهما فقد غوى"

(جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ کامیاب ہوا اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ بھٹک گیا)

آپ ﷺ نے فرمایا:

"بئس الخطيب أنت، قل ومن يعص اللّٰه ورسوله"(۱)

(تم بدترین خطیب ہو، کہو کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا)

غور کی بات ہے کہ جو بات کہی گئی وہ بالکل ٹھیک تھی کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات مانے گا، آپ کی اطاعت کرے گا، وہ صحیح راستہ پر چلا اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ بھٹک گیا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: تم بدترین خطیب ہو، آپ نے یہ اس لیے فرمایا کہ اس نے اللہ کے لیے بھی اور اس کے رسول ﷺ کے لیے بھی ایک ہی ضمیر کا استعمال کیا تھا، گویا اس سے ایک طرح کا یہ تشابہ ہو رہا ہے کہ وہ دونوں یعنی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ایک ہی درجہ کے ہیں، اس کو یوں کہنا چاہیے تھا:

"ومن يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعص الله و رسوله فقد غوى"

(اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ کامیاب ہوگا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ بھٹک گیا)

اس سے بات صاف ہوتی کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ بھٹکے گا، اب یہاں پر دونوں کو الگ الگ بیان کیا گیا، لیکن اس نے بجائے یہ کہنے کے "جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا" یہ کہہ دیا کہ جو ان دونوں کی نافرمانی کرے گا، اس سے گویا

---

(۱)صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة: ۲۰۴۷

دونوں کو ظاہراً ایک ہی درجہ میں رکھ دیا گیا جو عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔

آج ہم مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ عام طور سے آپ مسجدوں میں جگہ جگہ دیکھئے، ''یا اللہ'' بھی لکھا ہے، اس کے ساتھ ''یا محمد'' بھی لکھا ہے، اس میں اگر اللہ کے رسول ﷺ تشریف لے آتے تو آپ کی غیرت بھڑکتی، آپ سخت ناپسند فرماتے کہ ایک ''عبد'' ہے اور ایک ''معبود'' ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے، اگر مسلمان اس کو نہیں سمجھے گا تو آخر کون سمجھے گا، مسلمانوں کو توحید کا جو صاف ستھرا عقیدہ دیا گیا ہے، مسلمان اس کے داعی ہیں، اس کے معلم ہیں، کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کو اس عقیدہ کو بہت مضبوط پکڑنے کی ضرورت ہے، سب سے زیادہ جو بگاڑ پیدا ہوا ہے وہ یہی ہوا ہے کہ شیطان نے گویا کہ ایک نشہ پلا دیا، اور نشہ پلا کر مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کی، نشہ یہ پلایا کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے اتنے محبوب ہیں گویا کہ وہ خدائی میں شریک ہو گئے، اگر خدائی میں شریک نہ مانا جائے تو یہ تصور قائم کیا جا رہا ہے کہ گویا اللہ کے رسول ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کی جا رہی ہے، توہین کی جا رہی ہے، جو لوگ صحیح عقیدہ رکھتے ہیں ان کے بارے میں کھل کر کہا جاتا ہے کہ یہ محمد ﷺ کو نہیں مانتے، آپ ﷺ کی عظمت نہیں کرتے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اصل عظمت رسول ﷺ انہیں کے دلوں میں ہے، اس لیے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں، آپ ﷺ کی پیروی جتنی مضبوطی کے ساتھ یہ کرتے ہیں، زبان سے کہنے والے تو صرف زبان سے کہتے ہیں، اگر کوئی چیز زبان کا چٹخارہ ہے تو اس کی کیا حقیقت ہے، آدمی زبان سے جو چاہے کہے، لیکن جو چیز دل کے اندر نہیں اتری، وہ بالکل بے حقیقت ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت و عظمت کو جو آدمی صرف زبان سے کہتا رہے، اس کا ڈھنڈورا پیٹتا رہے تو یہ محبت نہیں، جب تک کہ وہ دل کے اندر نہ اتر جائے، آدمی اس کو پوری طرح دماغ سے قبول نہ کر لے، اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ آپ ﷺ جو کچھ بھی فرما رہے ہیں اس پر دھیان کیا جائے، اس پر

عمل کیا جائے، اس پر چلنے کی کوشش کی جائے۔

آپ ﷺ کو یہ خطرہ تھا کہ آپ ﷺ کے بارے میں بھی امت کے اندر کہیں غلو نہ پیدا ہو، اس لیے آپ نے صاف ارشاد فرمایا:

"لا تطرونی کما أطرت النصاری ابن مریم"

یعنی دیکھو مجھے اس طرح آگے نہ بڑھانا جیسا کہ نصاری نے عیسی ابن مریم کے ساتھ کیا، ان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنا دیا۔ آگے فرمایا:

"انما انا عبده فقولوا عبد الله و رسوله"(۱)

(بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، تو تم کہو کہ اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کے رسول ہیں)

آپ ﷺ اس کی تاکید فرما رہے ہیں، آپ کو شبہ تھا کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسی کے ساتھ کیا، کہیں یہ امت حضرت اقدس ﷺ کے ساتھ وہی نہ کرے کہ آپ کو خدائی کا درجہ جب تک نہ دے دیا جائے اس وقت تک چین نہ آئے، افسوس کی بات ہے کہ آپ جس چیز کی دعوت لے کر آئے، آج اسی کے خلاف کیا جا رہا ہے، پھر یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ماننے والے ہیں، یہ گویا کہ آپ ﷺ سے بغاوت ہے، آپ کہتے ہیں کہ مجھے کہو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس کا رسول ہوں، مگر ہم کہتے ہیں کہ نہیں، آپ نے تواضع میں یہ بات کہہ دی، آپ تو ہمارے رب ہیں، ہم نے مسجدوں میں لوگوں کو خود یہ جملہ کہتے سنا کہ

"نحن عباد محمد والله رب محمد"

(ہم محمد ﷺ کے بندے ہیں اور محمد ﷺ کا رب اللہ ہے)

محمد ﷺ کے بندے کہا جا رہا ہے، گویا کہ بندگی میں اس کا رنگ پایا جا رہا ہے، یہ ایک طرح کا کھلا ہوا شرکیہ جملہ ہے، جو آج نمازوں کے بعد لوگ برسر عام بعض جگہوں پر کہتے ہیں، میں نے خود ایک مسجد میں نماز پڑھی، جب امام صاحب نے سلام

(۱) البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب "واذکر فی الکتاب مریم": ۳٤٤٥

پھیرا تو انہوں نے یہ جملہ کہا، ہم اسی وقت وہاں سے اٹھے اور چل دیئے کہ یہ تو کھلا ہوا شرکیہ جملہ ہے، آپ ﷺ کہتے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں، کہو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں، اب تم کہہ رہے ہو کہ نہیں نہیں، ہم محمد ﷺ کے بندے ہیں، گویا یہ تقسیم کر لی کہ اللہ محمد ﷺ کا رب ہے اور محمد ﷺ ہمارے رب ہیں، یاد رہے یہ کھلا ہوا شرک ہے جو آج مسلمانوں میں پایا جا رہا ہے، اس پر بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، آپ ﷺ نے اس کو محسوس کیا، اسی لیے یہ بات فرمائی کہ جیسے عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ ان کے ماننے والوں نے کیا، اس طرح تم نہ کرنا، اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ آپ اللہ کے بندے ہیں تو کہا جائے کہ آپ اللہ کے بندے ہیں، یہ اللہ کی خاص پسندیدہ صفت ہے، سب سے زیادہ بندہ جس چیز سے اللہ کے قریب ہوتا ہے، وہ اللہ کی بندگی ہے، اس کی عبدیت ہے، آپ دیکھئے قرآن مجید کے اندر آپ ﷺ کا جہاں پر سب سے اونچا تذکرہ ہے، وہاں آپ کے لیے کون سا لفظ استعمال کیا گیا ہے، معراج سے بڑھ کر کون سا مقام ہوگا، سب سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ کو اللہ نے بلایا، وہاں ہم کلام ہوا اور نماز کا تحفہ دیا گیا، اور خدا جانے اللہ نے کس کس طرح سے نوازا، وہاں پر آپ ﷺ کے لیے جو لفظ استعمال ہوا وہ "عبد" کا لفظ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهِ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الأَقْصَی﴾ (الاسراء: ۱)

(پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی)

غور کا مقام ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتا تو یہاں کوئی دوسرا لفظ استعمال کر لیتا، ہزاروں الفاظ آپ ﷺ کے لیے استعمال ہو سکتے تھے، لیکن "عبد" کا لفظ استعمال کر کے اللہ نے یہ دکھایا کہ آپ کو اتنا نوازا گیا، اللہ سے قریب کیا گیا، اور آپ سے بڑھ کر نہ دنیا میں کوئی پیدا ہوا، نہ ہوگا، ساری نوازشیں آپ پر ہوئی ہیں اور ہوں

گی، قیامت تک ہوتی رہیں گی، آپ کو وہ مقام ملے گا جو کسی کو نہیں ملے گا یعنی ''مقام محمود''، لیکن واضح رہے کہ آپ اللہ کے بندے ہیں، اور آپ کی یہی عبدیت کاملہ ہے جس نے آپ کو یہ مقام عطا کیا ہے، آپ ﷺ کی پوری زندگی اسی عبدیت کاملہ کا مظہر ہے، اس لیے عقیدۂ توحید کو راسخ کرنے کے لیے، مکمل کرنے کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا جو مقام ہے وہ مقام آپ کا ہے، اور جو اللہ تبارک وتعالیٰ کا مقام ہے وہ مقام اللہ کا ہے، اللہ رب ہے باقی سب بندے ہیں، البتہ بندوں میں جو سب سے افضل ترین، اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہے، اس لیے جگہ جگہ آپ کو اس کی وضاحت ملے گی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو مقام ہے، وہ معبودیت کا، الٰہیت کا ہے، قرآن وحدیث میں اس کو بہت زیادہ نمایاں کیا گیا ہے، تا کہ غلط فہمیاں قائم نہ رہیں۔

غرض کہ مذکورہ بالا آیت میں آپ ﷺ کے ذریعہ اہل کتاب سے یہ کہا گیا کہ ہم اور تم میں ایک طرح توحید کا اشتراک ہے، لیکن جو ناقص توحید ہے اس کو تم کامل بنالو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم سب صرف ایک اللہ کی بندگی کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور ہم میں سے بعض بعض کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب نہ بنالے، رب بنانے کا مطلب یہی ہے کہ ان کو پوری طرح شارع سمجھ لیا جائے، وہ جو کہہ رہے ہیں گویا وہ آخری بات ہے، وہ جو چاہیں کریں، یہ بات اللہ کے رسول ﷺ ہی کے لیے نہیں، بلکہ بہت سے لوگ ہیں جو اپنے علماء کے لیے بھی یہ بات سمجھتے ہیں، ان کا تصور یہ ہے کہ وہ جو کہہ دیں بس وہی دین ہے، ایسا نہیں ہے، علماء جو کہہ دیں وہ دین نہیں ہے، علماء وہ کہتے ہیں جو دین ہے، اگر کوئی عالم ایسا ہو جو اپنی طرف سے کوئی بات کہہ دے، تو ظاہر ہے کہ اس کی بات نہیں مانی جائے گی، کھلی بات ہے کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے، یہ ہر آدمی جانتا ہے، ہر بچہ اور جاہل بھی جانتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے، اب کوئی عالم کہے کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض نہیں ہیں، فجر کی نماز معاف کردی گئی ہے، چار وقت کی نماز ہے، تو بچہ بھی چیخ کر کہے گا کہ میاں جھوٹ بولتے ہو، پانچ وقت کی نماز

ہے،اس کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں کہتا ہے، ہر جگہ موجود ہے، ساری دنیا جانتی اور مانتی ہے، آپ کون ہوتے ہیں اس میں تصرف کرنے والے،اس کے متعلق ایک بچہ کو بھی یہ کہنے کا حق ہے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں عالم ہے، یہ جو کہہ دے وہ صحیح ہے، تو یہ شرک کی قسم ہے، جیسا کہ آیت میں کہا گیا کہ ہم میں سے کوئی دوسرے کو رب نہ بنالے کہ وہ جو چاہیں کریں اور جو چاہیں کہیں، ہم ان کے مکلّف ہیں، جہاں یہ بات پیدا ہوگی وہاں تحریف کا دروازہ کھل جاتا ہے، حدیث میں فرمایا گیا:

"یرث هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تأویل الجاهلین و انتحال المبطلین و تحریف الغالین"(۱)

(اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل و متقی حامل و وارث ہوں گے جو اس دین سے جاہلوں کی دوراز کار تاویلات کو، اہل باطل کے غلط انتساب ودعوے کو اور غلو پسند لوگوں کی تحریف کو دور کرتے رہیں گے)

حدیث شریف میں تحریف کا دروازہ کھلنے کے متعلق اسی غلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ غلو محبت و تعظیم میں ہوتا ہے، واضح رہے کہ علماء کی اہمیت واحترام اپنی جگہ پر، لیکن وہ شارع نہیں ہیں، وہ جو چاہیں کہہ دیں ایسا نہیں ہے، وہ کتاب وسنت کے ترجمان ہوتے ہیں، وہ اپنی طرف سے نہیں کہتے، جو اپنی طرف سے کہے گا وہ بھٹکے گا، اگر کوئی کہتا ہے کہ تمہارے لیے نماز روزہ معاف، تو اس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں، آج یہی ہورہا ہے، بہت سے پیر دیہاتوں میں جاکر کہتے ہیں کہ اتنے پیسے دے کر کفارہ ادا کردو، تمہارے روزے معاف کئے جاتے ہیں، بس ہمیں دے دو، ہماری جیب بھرتے رہو، تمہاری نماز معاف ہے، ہمیں فی نماز سو روپئے دے دو، اس طرح وہ روپئے بٹور رہے ہیں، رمضان بھر کی پوری نماز معاف کرادی اور پندرہ ہزار ایک سے لے لیے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب پیسے بٹورنے کے طریقے ہیں، اور یہ آج کی کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ یہودی علماء نے یہی کیا، نصاری میں جو علماء تھے ان سے بھی اس

(۱) البیهقی، کتاب الشهادات، باب الرجل من أهل الفقه یسأل عن الرجل: ۲۰۷۰

طرح کی غلطیاں ہوئیں، یہودیوں نے تو خاص طور پر یہی کیا، وہ من مانی کرتے تھے، جہاں گئے وہاں کہا کہ بتاؤ تم کو کس طرح کا فتوی چاہیے، جو تمہیں چاہیے اس کے حساب سے فیس ادا کرو، تمہیں فتوی مل جائے گا، یہ وہ علمائے سوء ہیں جن سے امت کو سخت نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے، یہ امت کو گمراہ کرتے ہیں، یہ جو ہمارے عوام ہیں جو زیادہ نہیں جانتے، وہ موٹی موٹی باتیں تو جانتے ہیں، پانچ وقت کی نماز فرض ہے سب جانتے ہیں، اب اگر کوئی کہے کہ نماز معاف کی جاتی ہے تو ان کو ٹھٹک جانا چاہیے، یہ نہیں کہ کسی نے کہہ دیا تو فوراً مان لیں، اسلام میں یہ کسی کا مقام نہیں۔

اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان ''کلمہ سواء'' پر جمع ہونے کی دعوت دینے کے بعد فرمایا گیا کہ اگر وہ نہیں مانتے تو بس دعوت دے دو، اپنی بات پہنچا دو، پھر نہیں مانتے تو تم اس بات کو کہہ دو کہ تم گواہ رہنا کہ ہم تو ماننے والے ہیں، ہم اپنا سر جھکانے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہماری یہی شان ہونی چاہیے، ہم دعوت دیں گے، کوئی مانتا ہے یہ اس کی سعادت کی بات ہے، اور اگر نہیں مانتا تو اللہ نے اس کے لیے ہدایت نہیں رکھی، لیکن ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اسی راستہ پر چلتے رہیں۔

شان انبیاء

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَاداً لِّي مِن دُونِ اللّهِ وَلَـكِن كُونُواْ رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ﴾

(آل عمران: ۷۹)

(کسی انسان سے یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ نے اس کو کتاب اور حکمت و نبوت دی ہو پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ، چونکہ تم کتاب کی تعلیم کرتے اور جیسے تم خود اس کو پڑھتے رہے ہو)

اس آیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو خاص طور پر مخاطب کیا جا رہا ہے، ان کا کام یہ ہے کہ وہ توحید کی بات کہتے ہیں، وہ ایک اللہ کی طرف بلاتے ہیں، کسی بھی انسان کے لیے زیبا نہیں جس کو اللہ نے کتاب دی ہو، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو نبوت و حکومت بھی دی ہو، فیصلہ کی طاقت دی ہو، حکمت دی ہو، یعنی اس کو نبوت ملی ہو، اللہ نے اس کو رسالت سے سرفراز کیا ہو، اس کو حکمت دی ہو، دانائی کی باتیں دی ہوں، اس کے لیے پھر ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، وہ اس کی دعوت دے گا؟ اس کو تو اسی لیے بھیجا گیا کہ وہ ایک اللہ کی طرف بلائے، وہ توحید کی دعوت دے، ممکن نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ میرے بندے بن جاؤ، اور اللہ کو چھوڑ کر مجھ کو اپنا رب اور اپنا معبود سمجھ لو، وہ تو یہ کہے گا کہ تم جو کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو، اس کا نتیجہ تو

یہ ہونا چاہیے کہ تم ربانی بن جاؤ، اللہ والے بن جاؤ، ایک اللہ کو مانو، اس کے آگے سر جھکاؤ، یہ تمام انبیاء ورسل کی دعوت ہے، وہ اسی لیے آئے، لیکن ہوا یہ کہ انبیاء کے جانے کے بعد ان کے ماننے والوں نے غلو کیا، وہ جس چیز کی دعوت لے کر آئے، اس کے خلاف امتیوں نے انہیں کو خدا اور معبود بنا دیا، اس لیے اس سے ہمیشہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، دوسری امتوں نے جو کیا وہی کام یہ امت کر رہی ہے، آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی کہ جو بنی اسرائیل نے کیا، تم بالکل سارے کام وہی کروگے، فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے وہ کام اجتماعی کیئے تھے اور یہ امت وہی کام انفرادی کرے گی، کہیں پر کچھ لوگ یہ کام کریں گے، کہیں پر کچھ، یہاں تک فرمایا کہ

"لتتبعن سنن من كان قبلكم شبرا شبرا و ذراعا بذراع حتى لو دخلوا جحر ضب تبعتموهم"(۱)

(یقیناً تم اپنے پہلے لوگوں کی پیروی کروگے، بالشت بالشت اور گز گز کے بقدر بھی، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں تو تم بھی داخل ہوگے)

یہاں تک فرما دیا کہ

"لو أن أحدهم ضاجع أمه فى الطريق لفعلتم"(۲)

یعنی اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ کھل کر زنا کیا ہے تو اس امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوجائیں گے جو اپنی ماں کے ساتھ زنا کریں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ شرک کی جو شکلیں گذشتہ امتوں میں تھیں، آج وہی شکلیں تقریباً اس امت کے اندر بھی پیدا ہو رہی ہیں، لیکن اس سے ہمیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا تھا کہ کہیں تمہارے اندر ایسی بات نہ پیدا ہو، جس طرح

(۱)البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب، باب قول النبي ﷺ لتتبعن......: ۷۳۲۰

(۲)الفردوس بمأثور الخطاب: ۵۳۴۶، روایۃ ابن عباس

گذشتہ امتوں نے شرک یا برائیاں اختیار کیں تم بھی اسی راستہ پر پڑ جاؤ، آپ نے جو یہ بات ارشاد فرمائی کہ "تم ایسا کرو گے" اس میں تنبیہ ہے کہ ایسے کرنے والے ہوں گے، تو تم اپنے آپ کو ایسا مت بنا لینا، تم اس راستہ پر نہ پڑ جانا کہ تم خود بھی گمراہ ہو جاؤ، غلط راستہ پر پڑ جاؤ، اپنے آپ کو جہنم کے راستہ پر ڈال لو، ہمیشہ اپنے کو اس سے بچاؤ، ایک اللہ کو مانو، اسی کے آگے اپنے سر کو جھکاؤ۔

غیب کا علم

﴿وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (الأنعام: ٥٩)

(اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، وہی ان کو جانتا ہے، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے اس سے وہ واقف ہے اور جو پتا بھی گرتا ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو بھی خشک وتر ہے وہ سب کھلی کتاب میں موجود ہے)

اس آیت میں صاف صاف توحید کو واضح کیا جا رہا ہے کہ غیب کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں، یہ پانچ باتیں اس میں خاص ہیں، جن کا آگے ذکر آئے گا، اس کا قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ذکر آتا ہے، یہاں عمومی انداز میں ایک بات کہی جا رہی ہے کہ غیب کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں، غیب کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے، وہی جانتا ہے جو خشکی اور تری میں ہے، جو پتہ گرتا ہے اس کو اللہ ہی جانتا ہے، اور زمین کی تاریکیوں میں اور خشکی اور تری میں جو معمولی سے معمولی چیز بھی ہے وہ سب کا سب کھلی کتاب میں موجود ہے، اللہ نے جو چیزیں تقدیر میں لکھ دی ہیں، اس میں ایک ایک چیز لکھ دی، کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ نے نہ لکھی ہو، وہ سب اللہ کے پاس محفوظ ہے اور سب اللہ کے علم میں ہے، چھوٹی چیز ہو یا بڑی، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اللہ کے علم میں کیا ہوں گی؟ یاد رہے کہ اگر درخت سے پتہ گرتا ہے تو وہ بھی اللہ کے علم میں ہے، اگر ایک

ذرہ اڑتا ہے تو وہ بھی اللہ کے علم میں ہے، اس کے علم میں ہی نہیں اسی کے حکم سے ہوتا ہے، اس کی قدرت میں یہ چیز شامل ہے، وہ جو چاہے کرے، پورے پورے سمندروں کو اتھل پتھل کردے، پہاڑوں کو ادھر سے ادھر کردے، زمینوں اور آسمانوں کو توڑ موڑ کر بالکل تباہ و برباد کردینا اور ایک ذرہ کو ادھر سے ادھر کردینا سب اللہ کے ہاتھ میں بالکل یکساں اور برابر ہے، ایسا نہیں کہ اس کے لیے ایک کام مشکل ہے اور دوسرا آسان، اس کے سامنے دنیا کی کوئی قیمت نہیں، حدیث میں آتا بھی ہے کہ

"لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة ماء"(۱)

(اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اپنے باغی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا)

ظاہر ہے کہ آپ سے کوئی دشمنی مول لے اور آپ کا باغی ہو، دشمنی بھی معمولی نہ ہو بلکہ باغی ہوجائے، آپ کے قتل کے درپے ہو، آپ سے سخت بغاوت کرے، یقیناً آپ چاہیں گے کہ اس کو ایک حبہ نہ دیا جائے، اللہ جو قدرت رکھتا ہے، اگر یہ دنیا اس کے نزدیک قیمتی ہوتی تو اس کے جو باغی ہیں، کیا وہ دندناتے پھرتے؟ ان کو حکومتیں ملتیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک جگہ صاف صاف یہاں تک کہہ دیا کہ اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم ایمان چھوڑ دوگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کافروں کے گھروں کو سونے چاندی کا بنا دیتا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَوْلَا أَن يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَن يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفاً مِّن فَضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ☆ وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَاباً وَسُرُراً عَلَيْهَا يَتَّكِؤُونَ☆وَزُخْرُفاً وَإِن كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ﴾

(الزخرف: ۳۳-۳۵)

(۱)سنن الترمذی، کتاب الزهد، باب ما جاء في هوان الدنيا على الله: ۲٤۹۰

(اور اگر یہ (خیال) نہ ہوتا کہ تمام لوگ ایک ہی ملت (کفر) پر آجائیں گے تو ہم ضرور رحمٰن کا انکار کرنے والوں کے لیے ان کے گھروں کی چھتوں کو چاندی کا کر دیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھا کرتے ہیں، اور ان کے گھروں کے دروازے اور مسہریاں جن پر وہ ٹیک لگاتے ہیں، اور سونے کا کر دیتے جبکہ یہ سب کچھ نہیں بس صرف دنیا کی زندگی کے سامان ہیں اور آپ کے رب کے نزدیک آخرت پرہیز گاروں کے لیے ہے)

گویا اگر یہ ڈر نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ دنیا ساری کی ساری کافروں کو دے دیتا، ایمان والوں کو کچھ نہ ملتا، لیکن ڈر ہے کہ ایمان والے کہیں ایسی آزمائش میں نہ پڑ جائیں کہ ایمان چھوٹ جائے، اور خدانخواستہ کفر کی طرف چلے جائیں، اس لیے اللہ نے ایسا نہیں کیا، مگر معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے نزدیک دنیا کی کوئی قیمت نہیں، لہٰذا دنیا کا ادھر سے ادھر کر دینا، اس کا زیروزبر کر دینا اور پوری کائنات کا زیروزبر کر دینا، اور ایک ذرہ کا ادھر سے ادھر کر دینا سب کے اللہ کے لیے برابر اور آسان ہے، چیز چھوٹی ہو یا بڑی وہ سب جانتا ہے، اسی کی قدرت میں ہے، اس میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

خالق ارض وسماء

﴿بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنَّى يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ☆ذَلِكُمُ اللّهُ رَبُّكُمْ لا إِلَـهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ﴾ (الأنعام: ۱۰۱-۱۰۲)

(آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود بخشنے والا ہے، اس کے اولاد کہاں ہوسکتی ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں، ہر چیز کو اس نے پیدا کیا اور وہی ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے، وہی اللہ تمہارا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چیز اسی نے پیدا کی بس اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز کا کارساز ہے)

اس آیت میں گویا عیسائیوں کی کھل کر تردید کی جارہی ہے، جو کہتے تھے کہ حضرت عیسی معاذ اللہ خدا کے بیٹے ہیں، اللہ فرماتا ہے کہ اس کی کوئی بیوی نہیں تو اس کا بیٹا کہاں سے ہوجائے گا اور بیوی اور بیٹے کے جو جھمیلے ہیں، اس کے نتیجہ میں تو کیا کچھ ہوتا ہے، آدمی کہاں کہاں پریشان ہوتا ہے، اللہ کی ذات تو ان تمام چیزوں سے پاک اور بری ہے، وہ تن تنہا ہے جو چاہتا ہے فیصلے کرتا ہے، وہ نہ کسی بیٹے کے دباؤ میں ہے، نہ کسی بیوی کے دباؤ میں، نہ اس کی کوئی بیوی نہ کوئی بیٹا، نہ کوئی ایسا کہ وہ اس کی بات ماننے پر مجبور ہوجائے، وہ تو جس کی بات مانتا ہے پیار میں مانتا ہے، مجبور ہوکر نہیں مانتا، حضرت محمد ﷺ کی جو شفاعت ہوگی قیامت میں، وہ آپ ﷺ پر جو اللہ تبارک و

تعالیٰ کا کرم ہے اور اظہار محبت ہے، یہ اس کی ایک شکل ہے، ایسا نہیں ہے کہ آپ اگر کہہ دیں گے تو خدا نخواستہ اللہ مجبور ہو جائے گا، گذشتہ صفحات میں ذکر تھا کہ آپ چاہتے تھے ابو طالب مسلمان ہو جائیں، لیکن اللہ کی مرضی نہیں تھی، اس لیے مسلمان نہیں ہوئے، معلوم ہوا کہ ہوتا وہ ہے جو اللہ چاہتا ہے، کسی کے بس میں کچھ نہیں۔

معبود برحق

﴿اللّٰهُ لَا إِلَـهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاء وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَؤُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ (البقرة: ٢٥٥)

(وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے، کون ہے جو بغیر اس کی اجازت کے اس کے پاس سفارش کر سکے، ان کا اگلا پچھلا سب جانتا ہے، اس کے علم کے کسی حصہ کا بھی وہ احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سموئے ہوئے ہے اور ان دونوں کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی بلند و بالا بڑی عظمت والا ہے)

اس آیت میں بتا جا رہا ہے کہ وہی تنہا اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ حی و قیوم ہے، نہ اس کو اونگھ آتی ہے، نہ نیند آتی ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، کس کو یارہ کہ اس کے پاس سفارش کر سکے، مگر یہ کہ اس کی اجازت ہو، یہ سمجھنے کی چیز ہے، اس سلسلہ میں بھی لوگوں کے اندر بہت غلط فہمیاں ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جو سفارش کریں گے اس میں آپ کو اختیار کامل ہے کہ آپ جو

چاہیں، جس کی چاہیں سفارش کریں، اس آیت میں بات صاف کردی گئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اجازت سے ہی سفارش ہوگی، ایسا نہیں کہ جس کا جی چاہے وہاں کھڑا ہوجائے، اور سفارش شروع کردے، سفارش جو کرے گا وہ اللہ کے حکم سے کرے گا، اللہ کی اجازت سے کرے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے خاص بندوں کو یہ اجازت دیں گے، جن میں سب سے بڑا مقام سرکار دو عالم ﷺ کو حاصل ہے۔

شفاعت رسول ﷺ

آپ ﷺ کو متعدد شفاعتوں کی اجازت ملے گی، اس میں شفاعت کبری بھی ہے، جس کی تفصیل حدیثوں میں آتی ہے کہ جب حساب وکتاب مکمل ہوجائے گا، اور لوگ چاہیں گے کہ جنت میں داخل ہوں، تو چونکہ اجازت نہیں ہوگی، لوگ پریشان کھڑے ہوں گے، چنانچہ تمام لوگ اپنے اپنے نبیوں کے پاس جائیں گے اور جاکر کہیں گے کہ آپ اللہ سے سفارش کیجئے کہ ہمیں جنت میں داخلے کی اجازت ملے، تو ہر نبی معذرت کرے گا، یہاں تک کہ سب کے سب اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئیں گے اور آکر کہیں گے کہ آپ ہماری سفارش کردیجئے کہ اللہ ہمیں جنت میں داخل کرے، آپ فرمائیں گے کہ ہاں میں سفارش کروں گا، مجھے اس کا حق ہے، یہ حق اللہ تبارک وتعالیٰ آپ ﷺ کو عطا فرمائیں گے، اس شفاعت نبوی ﷺ کے متعلق واضح رہے کہ یہ نہیں ہوگا کہ آپ آکر کہیں: اے اللہ! ان سب کو جنت میں داخل کردیجئے، جیسا کہ لوگوں کا تصور ہے، بلکہ اس کی ترتیب یہ ہوگی کہ آپ جائیں گے اور سجدہ میں پڑجائیں گے، حدیثوں میں آتا ہے کہ ایسے کلمات حمد اللہ کی طرف سے القاء کئے جائیں گے جو کبھی نہ اس سے پہلے القاء کئے گئے اور نہ اس کے بعد القاء کئے جائیں گے، اور آپ ﷺ ان کلمات حمد سے اللہ کی حمد وثنا بیان کریں گے، عاجزی فرمائیں گے، سجدہ میں گر کر گڑگڑائیں گے، پھر اللہ فرمائے گا کہ

"يا محمد ارفع راسك، سل تعطه، اشفع تشفع"(۱)
(اے محمد! اپنے سر کو اٹھایئے، مانگئے عطا کیا جائے گا، سفارش کیجئے، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی)

یہ شفاعت کی اصل شکل ہے، جب آپ اللہ کے دربار میں عاجزی فرمائیں گے تو آپ کی شفاعت ہوگی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ تمام لوگوں کو جنت میں داخل فرمادیں گے، پھر آپ ﷺ بہت سے گناہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے، لیکن یادرہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو شفاعت سے محروم ہوں گے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ حوض کوثر پر ہوں گے، کچھ لوگ آپ کے سامنے سے گذریں گے، آپ فرمائیں گے کہ میری امت کے لوگ ہیں، میں ان کی سفارش کروں، تو کہا جائے گا کہ نہیں، انہوں نے آپ کے بعد خدا جانے کیا کیا نئی چیزیں ایجاد کرلیں، ان کا آپ سے کوئی تعلق نہیں، یہ آپ کی امت میں گویا نہیں ہیں، یہ آپ کی امت میں تھے مگر نکالے گئے، یہ ان خرافات اور بدعات کا نتیجہ ہے کہ جو لوگوں نے اپنی طرف سے اختیار کرلیں، اس کے نتیجہ میں وہ آپ ﷺ کی شفاعت سے بھی محروم کئے جائیں گے، الفاظ حدیث یہ ہیں:

" ليردن علي أقوام أعرفهم ويعرفونني ثم يحال بيني وبينهم، فأقول: انهم مني، فيقال: انك لا تدرى ما أحدثوا بعدك، فأقول: سحقا سحقا، لمن غير بعدى"(۱)
(بہت سے ایسے لوگ میرے پاس پہنچیں گے کہ میں ان کو پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھ کو پہچانتے ہوں گے، لیکن پھر ان کے اور میرے درمیان دوری کردی جائے گی، چنانچہ میں کہوں گا: یہ لوگ تو میرے (امتی) ہیں، تو جواب دیا جائے گا: آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ کے

(۱)صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب أدنى أهل الجنة منزلة فيها: ۵۰۱
(۲)صحيح البخارى، كتاب الرقاق، باب في الحوض: ۶۵۸۳-۶۵۸۴

جانے کے بعد کیا کیا ہے، تو میں یہی کہوں گا کہ ایسے لوگوں کے لیے
ہلاکت ہے جنھوں میرے بعد دین میں تبدیلی کردی)

اس سے معلوم ہوا کہ شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے ہوگی، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دیں گے، تو اس کے بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے، اس سلسلہ میں لوگوں نے عجیب وغریب تصور قائم کر رکھا ہے کہ گویا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کرسی پر غضب ناک بیٹھا ہوا ہے، ہر ایک کو جہنم میں جھونکنا چاہتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، بس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں، گویا کہ اللہ سے جھگڑ رہے ہیں کہ سب کو جنت میں داخل کردیا جائے، کسی کو جہنم میں نہ بھیجا جائے، یہ عجیب وغریب ایک تصور ہے کہ اللہ کو غضب ناک بتایا جاتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سراپا رحمت بتایا جاتا ہے، واضح رہے کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمت ہیں، یہ آپ کی رحمت اللہ ہی نے پیدا فرمائی، حدیث میں آتا ہے کہ اللہ نے محبت کے سو حصے کئے، ایک حصہ دنیا میں بھیجا، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"ان اللّٰه خلق الرحمة يوم خلقها مائة رحمة، فأمسك عنده تسعا و تسعين رحمة وأرسل فى خلقه كلهم رحمة واحدة"(۱)

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں پیدا فرمایا، پھر اس میں سے رحمت کے ننانوے حصے اپنے پاس روک لیے، اور ایک حصہ رحمت اپنی مخلوق میں دے دی)

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسی محبت کے اثر سے ماں بیٹے کو چاہتی ہے، باپ بیٹے کو چاہتا ہے، سب ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، گویا یہ محبت کا ایک حصہ ہے، جس کے نتیجہ میں دنیا میں محبتیں پائی جاتی ہیں، اور محبت کے ننانوے حصے اللہ ہی کے پاس ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بعض بعض ایسی مثالیں بیان فرمائی ہیں جیسے کوئی ماں ہو، وہ اپنے بیٹے کو آگ میں ڈالنا گوارہ نہیں کرتی، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ ایسا شفیق ہے،

---

(۱)صحيح البخارى، كتاب الرقاق، باب الرجاء مع الخوف: ٦٤٦٩

اپنے بندوں پر ایسا مہربان ہے کہ وہ اپنے بندوں کو آگ میں ڈالنا نہیں چاہتا، لیکن جب بندے خود غلط راستے پر پڑتے ہیں، خدا سے بغاوت کرتے ہیں، اور اس سے سرکشی کرتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جہنم میں ڈالتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، ان میں سب سے پہلے اس کی صفت رحمت، رحمان ورحیم کا ذکر ہے، جب سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس میں بار بار رحمٰن ورحیم کا ذکر آتا ہے، لہٰذا یہ نہایت غلط تصور ہے کہ وہ غضب ناک ہے اور سب کو جہنم میں جھونک دے گا، اللہ کی شان عالی میں گویا کہ یہ ایک طرح کی گستاخی ہے، اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ رحمٰن ورحیم ہے، اپنے بندوں پر مہربان ہے، اس کی مہربانی کا نتیجہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کو شفاعت کے لیے کھڑا کردے گا کہ آپ سفارش کرتے جایئے، اور جن لوگوں کی آپ سفارش کریں گے ان کی بخشش کی جاتی رہے گی، اس میں ایک طرف آپ ﷺ کے مقام بلند کا بھی اشارہ ہے کہ آپ کو قیامت میں بھی نوازا جارہا ہے، آپ ایک سردار کی طرح کھڑے ہیں اور سفارش کررہے ہیں، دوسری طرف یہ اللہ کی رحمت کا مظہر بھی ہے کہ اللہ اپنی رحمت ہی سے آپ ﷺ کو سفارش کے لیے کھڑا کررہا ہے اور آپ سفارش فرمارہے ہیں، تو یہ تصور صحیح ہونا چاہیے کہ وہاں جو بھی سفارش کرے گا وہ اللہ کی اجازت سے کرے گا، اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ کون ہے جو اللہ کے پاس سفارش کرسکے سوائے اس کی اجازت کے، جو کچھ بھی ان کے آگے پیچھے ہے، وہ سب جانتا ہے، اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ادنی سے ادنی علم کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے، سوائے اتنے حصے کے جتنے کو اللہ چاہے، اپنے نبیوں کو، رسولوں کو اتنا حصہ دیتا ہے جتنا چاہتا ہے۔

نبی ﷺ کا علم

اللہ کے رسول ﷺ جو آخری نبی اور سب سے برگزیدہ، سب سے بڑے نبی ہیں، سب سے محبوب نبی ہیں، آپ ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے علم کا ایک حصہ عطا فرمایا، لیکن یہ سمجھنا کہ سب کچھ عطا فرمادیا، آپ ﷺ ہر چیز کے جاننے والے

ہیں، یہ کلمہ شرک ہے، اس لیے کہ اس میں کیا ہوا؟ اس میں یہ ہوا کہ اللہ کی ’’عالم الغیب‘‘ اور ’’علام الغیوب‘‘ جو صفت ہے، یعنی تمام چیزوں کے جاننے والے کی صفت، ہم نے اس صفت میں دوسرے کو شریک کر دیا، ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے، آپ ﷺ مطلقاً عالم الغیب نہیں ہیں، آپ ﷺ اس غیب کو جاننے والے ہیں جو غیب اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو بتایا، ایسی بہت ساری چیزیں ہیں، آپ نے پیشین گوئیاں فرمائیں، بہت سارے واقعات آپ نے بیان کئے، اللہ نے آپ کو بتائے، لیکن کتنے واقعات ہیں کہ آپ ﷺ وہ چیز نہیں جانتے جو آپ کے پیچھے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، حجرہ شریفہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے، آپ نے فرمایا: اندر تشریف لے آیئے، وہ کہنے لگے میں نہیں آسکتا، آپ نے کہا: کیا بات ہے؟ تو کہنے لگے کہ آپ کی چارپائی کے نیچے کتے کا بچہ ہے، اور جہاں کتا یا کتے کا بچہ ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں، پھر آپ نے کتے کا وہ بچہ نکلوایا۔(۱)

اس سے پتہ چلا کہ آپ ﷺ کو معلوم نہیں تھا کہ کتے کا بچہ یا جو جانور ہے وہ آپ کے پلنگ کے نیچے ہے، معلوم ہوا کہ آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے، ہر چیز آپ جانیں ایسا نہیں ہے، کتنی چیزیں آپ نے بتادیں، اور کتنی چیزیں نہیں بتائیں، جتنا اللہ نے آپ کو بتادیا وہ آپ نے بتادیا، جو غیب کی خبریں اللہ نے آپ کو دیں وہ آپ نے امت کو بتائیں، لیکن یہ کہ آپ تمام چیزوں کے جاننے والے ہیں، ایسا نہیں ہے، کتے والی یہ ایک مثال عرض کی گئی، اگر حدیث کا مطالعہ کریں تو ایسی دسیوں مثالیں، دسیوں واقعات ہیں جن میں یہ حقائق سامنے آجائیں گے، بعض بعض عجیب وغریب واقعات ہیں، قرآن مجید میں اس کے اشارے بھی ہیں، ایک مرتبہ ایک صاحب آئے اور انہوں نے شکایت کی کہ فلاں صاحب نے ہمارے یہاں چوری کی ہے، آپ ﷺ

(۱) ملاحظہ ہو: سنن أبي داؤد، کتاب اللباس، باب في الصور: ٤١٥٩

نے معاملہ طلب کیا، تمام لوگ آئے اور لوگوں نے اپنے اپنے دلائل دیئے، تو جن کو چور سمجھا جارہا تھا، چونکہ ان کو زباں دانی حاصل تھی، وہ چرب زبان تھے، اس لیے انہوں نے اپنی بات بڑی طاقت سے کہی، اتنی طاقت سے کہی کہ آپ ﷺ نے سوچا کہ یہ حق پر ہے، اور آپ ان کے لیے فیصلہ کرنے والے تھے، بعد میں پتہ چلا کہ وہ حق پر نہیں ہے، اس سلسلہ میں باقاعدہ قرآن مجید کی آیت اتری اور یہ کہا گیا کہ آپ اس کے طرفدار نہ بن جائیں جو کہ گویا چرب زبانی سے اپنی بات ثابت کررہا ہے، حالانکہ وہ حق پر نہیں ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِنَّـا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّهُ وَلاَ تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيماً﴾

(النساء: ۱۰۵)

(یقیناً ہم نے آپ پر ٹھیک ٹھیک کتاب اتار دی تا کہ جیسا اللہ نے آپ کو راستہ دکھایا اس کے مطابق آپ لوگوں میں فیصلے کرتے رہیں اور خیانت کرنے والوں کے طرف دار نہ ہو جائیں)

اس سے یہ بات صاف طور پر واضح کردی گئی کہ اصل مسئلہ آپ ﷺ کے سامنے نہ آسکا، جب اللہ نے بتایا تب آپ کو معلوم ہوا، تو ان واقعات سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے، بلکہ آپ ﷺ غیب کی وہ باتیں جانتے تھے، جو اللہ نے آپ کو بتائیں، اس لیے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ آپ مطلقاً عالم الغیب ہیں تو یہ مشرکانہ عقیدہ ہے، ہم اگر یہ نہ کہیں کہ وہ کافر ہو گیا، مشرک ہو گیا تو اتنا تو ضرور کہیں گے کہ یہ عقیدہ مشرکانہ ہے، البتہ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ درحقیقت کافر یا مشرک ہوا کہ نہیں، چونکہ حضور ﷺ نے ہمیں منع کیا کہ جب تک کسی کے اندر ایمان کی ایک علامت بھی ہے تو کافر مشرک نہ کہو، اس لیے ہم لوگ آسانی سے نہ کسی کو کافر کہتے ہیں نہ مشرک، لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ اس کا یہ عمل مشرکانہ ہے، اس کا یہ عقیدہ مشرکانہ ہے،

تو اگر کوئی اللہ کے رسول ﷺ کو عالم الغیب سمجھتا ہے، تو یہ عقیدہ مشرکانہ کہلائے گا، اور ڈر ہے کہ خدانخواستہ اس کا ایمان باقی نہ رہے۔

دعوت فکر و عمل

غرض کہ اپنے عقیدہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، اور جو بھی ہمارے اندر ایسی باتیں داخل ہو گئیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ لاشعور میں داخل ہوئی ہوں، ان کو ٹٹولنے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم خالص عقیدۂ توحید کو مضبوط کریں، یہ سمجھیں کہ اللہ اپنی ذات میں بھی تنہا ہے اور اپنی صفات میں بھی تنہا ہے، اور عبادت کے لیے اس کی ذات تنہا ہے، نہ کسی کی بندگی کی جائے گی، نہ کسی کی وہ عبادت کی جائے گی، جس کو انتہائی تعظیم کہتے ہیں، یا آخری درجہ کی محبت جس کے نتیجہ میں آدمی پھر عبادت کرتا ہے، یہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے لیے ہے، اللہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی یہ عمل جائز نہیں۔

عقیدۂ توحید

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ☆اللَّهُ الصَّمَدُ☆لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ☆وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ﴾ (الاخلاص: ١-٤)

(بتا دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے، وہ اللہ جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں،، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اور کوئی بھی اس کے جوڑ کا نہیں)

سورۂ اخلاص قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی سورت ہے، جس میں توحید کے عقیدہ کو بہت طاقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو سورۂ اخلاص کہتے ہیں، یعنی آدمی ہر طرف سے کٹ کر ایک اللہ کا ہو جائے اور تنہا اسی کو سب کچھ سمجھے، وہی ضرورت کا پورا کرنے والا اور تمام مسائل کا حل کرنے والا ہے، اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے، اور پھر اس کے بعد فرمایا کہ "اللّٰه الصمد" وہ اللہ ''صمد'' ہے، **صمد** کا جو لفظ ہے، اس کے ترجمے میں بہت سارے لوگ ''بے نیاز'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن جو صحیح مفہوم ہے وہ ادا نہیں ہوتا، حقیقت میں ''صمد'' اس کو کہتے ہیں جو سب سے بے نیاز ہو، لیکن سب اس کے نیاز مند ہوں، صرف بے نیاز کا جو لفظ ہے اس میں یہ مفہوم آ جاتا ہے کہ نہ اس کو کسی کی ضرورت ہے اور نہ کسی کو اس کی ضرورت ہے، حالانکہ ''صمد'' کا جو لفظ ہے اس میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ کسی کا ضرورت مند نہیں ہے لیکن سب اس کے ضرورت مند ہیں، سب اس کے سامنے اپنی حاجتیں رکھتے ہیں، اور

اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْوَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ ؛ اس میں وہ عقیدہ جو عیسائیوں کا ہے اس کی بھی نفی کی گئی ہے، اور مطلقاً یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرے، توالد وتناسل کا جو سلسلہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے بے نیاز ہے، اور یہ چیز اس کے لیے عیب ہے، اور وہ ہر عیب سے دور ہے اور پاک ہے، اسی لیے نہ اس کا کوئی باپ ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور پھر سورت کے اخیر میں جو بات فرمائی گئی وہ یہ کہ اس کے برابر کا کوئی نہیں ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ یعنی اس کے جیسا کوئی نہیں، اس کے برابر کا کوئی نہیں، سب اس کی مخلوق ہیں، وہ تنہا خالق ہے، ظاہر ہے کہ جو پیدا کرنے والا ہے تو اس کے سامنے مخلوقات میں سے کوئی بھی ہو اور کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن کوئی مخلوق میں خالق کے برابر نہیں ہوسکتا، جو خالق کا مخلوق کا فرق ہے وہ بہر حال قائم رہے گا، اللہ اور اس کی صفات کے سوا دنیا میں جو کچھ موجودات ہیں وہ سب کے سب حادث ہیں، اور سب اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اور اللہ کی ذات قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، وہ ازلی ہے، ابدی ہے، تو وہ مخلوق جو کہ حادث ہو، جس کو اللہ ہی نے پیدا کیا، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ یعنی اپنے خالق کی برابری نہیں کرسکتا۔

غیب کی کنجیاں

﴿إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَداً وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (لقمان: ٣٤)

(یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش کرتا ہے اور رحم کے اندر جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس جگہ اس کی موت ہوگی بلاشبہ اللہ خوب جانتا پوری خبر رکھتا ہے)

قیامت

اس آیت میں پانچ چیزیں بیان کی گئی ہیں، ان کو ''مفاتح الغیب'' کہتے ہیں، یعنی یہ غیب کی کنجیاں ہیں، یہ وہ پانچ چیزیں ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا، ان میں سب سے پہلی چیز قیامت ہے، جس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اور اگر کوئی اس کے متعلق سوال بھی کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے خوش نہیں ہوتا، قرآن مجید میں اس کی وضاحت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الأعراف: ١٨٧)

(وہ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں کہ کب اس کے برپا ہونے کا وقت ہے، کہہ دیجیے اس کا علم تو میرے رب کے پاس ہے، وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کردے گا، آسمانوں اور زمین پر وہ بھاری ہے، اچانک ہی وہ تم پر آجائے گی، وہ آپ سے ایسا پوچھتے ہیں کہ گویا آپ اس کی کرید میں ہیں کہہ دیجیے اس کا پتہ اللہ ہی کو ہے لیکن اکثر لوگ بے خبر ہیں)

اس آیت میں تقریباً پانچ چھ جملے ایسے استعمال کیے گئے ہیں جن میں بار بار یہ تاکید ہے کہ قیامت کا علم سوائے اللہ کے کسی کے پاس نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو اپنے پاس مخفی رکھا ہے، کسی کے لیے اس کو ظاہر نہیں کیا، کوئی بڑے سے بڑا نبی ہو، کوئی فرشتہ ہو، اللہ نے قیامت کو سب سے مخفی رکھا ہے، البتہ علامات قیامت بیان فرمائی ہیں، لیکن علامات بھی دو طرح کی ہیں، بعض قریبی علامات ہیں اور بعض عام علامات ہیں، تو جو عام علامات ہیں وہ تو ایسی ہیں کہ سینکڑوں ہزاروں سال پہلے ان کا آغاز ہوسکتا ہے، مثلاً: آپ ﷺ نے اپنی بعثت کو قیامت کی علامت قرار دیا، فرمایا کہ میں آگیا اور میں آخری نبی ہوں، اب میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اب میرے بعد قیامت آئے گی، گویا یہ بھی ایک علامات قیامت میں سے ہے، اس کے علاوہ بہت سی قریبی علامات آپ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ جب وہ آجائیں گی تو گویا جب قیامت کا بالکل قرب ہوگا، تب وہ علامات ظاہر ہوں گی، جیسے دجال کا نکلنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اترنا اور آخری علامت سورج کا مشرق کے بجائے مغرب سے نکلنا ہے، جس کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا، تو یہ قریب کی علامت ہے، اور جو بعید کی علامات ہیں ان سے بھی کوئی قیامت کا تعین نہیں کرسکتا کہ قیامت کب آئے گی، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو چھپایا ہے، اور اس لیے چھپایا ہے کہ یہ امتحان کا دن ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسانوں کو اس مقصد سے بھیجا ہے کہ وہ دیکھے کہ لوگ کیسے اعمال

کرتے ہیں، اب ان اعمال کا جس دن بدلہ ملنا ہے، اس دن کو اللہ نے چھپا رکھا ہے، اس لیے کہ اگر چیز متعین ہو جاتی تو اس کی نوعیت بدل جاتی، امتحان کی چیزیں عام طور پر مخفی ہوتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کو بھی چھپا رکھا ہے تاکہ لوگ اس کی تیاری کریں، چنانچہ جب جس کی موت آئے گی، وہ یہ سمجھے کہ گویا اس کی قیامت آگئی، اور اگر کوئی زندہ رہا اور قیامت اس پر آگئی تو اس کا معاملہ اس کے ساتھ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے تمام بندوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں گے، بندوں نے جیسے اعمال کیے ہوں گے، اسی کے اعتبار سے اللہ کے یہاں اس کا صلہ دیا جائے گا۔

بارش

مذکورہ آیت میں دوسری چیز فرمائی گئی: ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ یعنی وہی بارش اتارتا ہے اور وہی یہ بھی جانتا ہے کہ بارش کب ہوگی، بارش نازل کرنے کا جو عمل ہے، یہ ایسا ہے کہ اس سلسلہ میں دنیا نے بہت کوشش کی، جہاں سوکھا ہوتا ہے، بارشیں کم ہوتی ہیں تو جو بڑی ترقی یافتہ قومیں ہیں، انہوں نے بہت کوششیں کیں کہ کسی صورت سے بھی بارش ہو جائے، ان کو کچھ کامیابی تو ملی لیکن اس میں اتنی لمبی رقم خرچ ہوئی کہ خرچ کا دس فیصد بھی حاصل نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ اس بارش سے جس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہو کچھ حاصل ہونے والا نہیں، غرض کہ باہر ملکوں نے کچھ بارش کرنے کی شکل پیدا کی، بھاپ پیدا کی، کچھ گیسیں جمع کیں، اور نہ جانے کیا کچھ کیا، اس پر اتنا خرچ ہوا اور اس کے بعد بارش بہت معمولی ہوئی، کچھ قطرے گرے اور اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا، اس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ بارش کا نظام محض اللہ کی قدرت میں ہے، وہ جب چاہتا ہے بارش نازل فرماتا ہے، جہاں چاہتا ہے نازل فرماتا ہے اور کب بارش ہوگی یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے علم میں ہے، آج کل محکمہ موسمیات والے پیشین گوئی کرتے رہتے ہیں، لیکن عام طور پر اس کا الٹا ہی ہوتا ہے، کبھی انہوں نے کہا کہ بارش کم ہوگی تو بہت ہوتی ہے، یہاں تک کہ تباہی تک آجاتی ہے، درحقیقت ان کا ایک

اندازہ ہوتا ہے جو ہواؤں کی رفتار سے وہ طے کرتے ہیں، ہواؤں کی جو رفتار ہے اس کو باقاعدہ آلات کے ذریعہ ناپ کر یہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اتنے وقت پر فلاں جگہ یہ بادل پہنچیں گے، یہ بادل برسنے والے ہیں تو امید ہے کہ فلاں جگہ بارش ہوگی، لہٰذا کبھی اللہ چاہتے ہیں تو وہیں کرتے ہیں، اور اگر نہیں چاہتے تو نہیں کرتے۔

غرض کہ یہ چیز بھی ایسی ہے جو کوئی نہیں جانتا، اور یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے، فرعون کے زمانہ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ سوکھا پڑا، چنانچہ اس کے حالی موالی سب جمع ہوئے اور کہا کہ آپ تو خدا ہیں، بارش نازل کردیجئے، بہت پریشانی ہے، اب اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لہٰذا اس نے اپنے ان جنات کو بلایا جو شیاطین کی صفت رکھتے تھے، اور کہا کہ بڑی مصیبت پڑ گئی ہے، تم لوگ کوئی تدبیر کرو کہ بارش ہوجائے، انہوں نے کہا: کیا مشکل ہے، رات کو اپنے کارندوں کو بھیج دیا، انہوں نے فضا پر جا کر پیشاب کیا بارش کیا ہوئی ایک آفت آگئی، ظاہر بات ہے کہ یہ ایک لطیفہ ہے، لیکن بعض اسرائیلی روایتوں میں اس طرح کی چیزیں ملتی ہیں۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صاحب کھیتی کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ایک بادل سے کہا کہ تم اس شخص کی کھیتی پر جاؤ اور وہاں برسو، اس کو ایک آدمی نے اللہ کے حکم سے سن لیا اور وہ بادل کے پیچھے پیچھے لگ گیا تا کہ معلوم کرسکے کہ یہ کہاں جا کر برستا ہے، چنانچہ بادل ایک جگہ گیا اور وہاں برس گیا، وہاں نالی کے ذریعہ سے پورا پانی ایک کھیت میں پہنچ گیا، اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کھیت میں کام کر رہا ہے، اس سے جا کر ان صاحب نے پوچھا کہ عجیب معاملہ ہے، تمہارے کھیت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بادل کو حکم دیا کہ برسے اور ایسے برسے کہ تمہارے کھیت کو سیرابی ہو، تو تمہارا ایسا کیا عمل ہے؟ اس نے کہا: ایسا کوئی خاص عمل نہیں ہے، بس یہ ہوتا ہے کہ کھیت میں جو پیداوار ہوتی ہے، میں اس کے تین حصے کرتا ہوں، ایک حصہ بیوی بچوں کے لیے خود استعمال کرتا ہوں، اور ایک حصہ خیرات کردیتا ہوں، ایک حصہ دوبارہ اسی کھیت میں

ڈال کر بو دیتا ہوں، بس یہی اللہ کا میرے اوپر فضل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے سیراب کرتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے، اس کے لیے بارش مصیبت بھی بنا دیتا ہے، سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔

رحم مادر

مذکورہ آیت میں تیسری چیز بیان فرمائی: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ یعنی ماؤں کے پیٹ میں کیا ہے وہی جانتا ہے، کوئی نہیں جانتا ہے، اب کوئی کہے کہ اب تو الٹراساؤنڈ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہے، بچہ ہے بچی ہے، ناقص ہے کامل ہے، لیکن ظاہری بات ہے کہ وہ الٹراساؤنڈ سے معلوم ہوتا ہے، یعنی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے، اگر کوئی بغیر دیکھے بتائے تو یہ غیب ہے اور جب دیکھ کر بتا رہا ہے تو غیب کہاں ہے؟ وہ تو سامنے کی چیز ہے، سامنے کی چیز کوئی بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ صرف یہی بتا سکتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی ہے، ناقص ہے یا کامل ہے، لیکن کس چیز میں ناقص و کامل ہے؟ یہ نہیں معلوم، اخلاق میں کیسا ہے اور اس کا دماغ کیسا ہوگا؟ وہ کس کیفیت کے ساتھ پیدا ہوگا؟ یہ ساری چیزیں اللہ ہی جانتا ہے، کوئی نہیں جانتا، کوئی ڈاکٹر سے پوچھے کہ دماغ اس کا ٹھیک ہے یا نہیں؟ حافظہ مضبوط ہے یا کمزور ہے یا اور کیا ہے؟ یہ ساری جو اندر کی تفصیلات ہیں یہ الٹراساؤنڈ کے بعد بھی معلوم نہیں ہوتیں، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، یہ سب کوئی نہیں جانتا، اور جو ظاہری چیزیں بتائی جاتی ہیں، یہ دیکھ کر بتائی جاتی ہیں، جس کا تعلق غیب سے نہیں ہے۔

کل کا علم

چوتھی چیز فرمائی گئی: ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ یعنی کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اس چیز کا تو سب ہی کو تجربہ ہے، بسا اوقات آدمی بڑے بڑے ارادے کرتا ہے، لیکن جو وہ سوچتا ہے اس کے بالکل خلاف ہوتا ہے، ہر شخص اپنی

زندگی میں دیکھے تو اس طرح کی ایک دو نہیں، دسیوں بیسیوں مثالیں ملیں گی، حضرت علیؓ کا جملہ بہت مشہور ہے:

"عرفت ربی بفسخ العزائم"

(میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے جانا)

ہم سب جانتے ہیں کہ آدمی کیسے کیسے ارادے کرتا ہے کہ یہ کریں گے، یہ کریں گے، لیکن ایسے ایسے موانع پیش آجاتے ہیں، جس کا تصور بھی نہیں ہوتا، آدمی سوچتا بھی نہیں کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، لیکن اللہ کا حکم ہے کہ جب اللہ چاہتا ہے تو سب ہوتا چلا جاتا ہے، انسان جتنے ارادے کرتا ہے، وہ سب ہوتے چلے جاتے ہیں، لیکن اگر اللہ کا فیصلہ نہ ہو تو بے شمار رکاوٹیں کھڑی ہوجاتی ہیں، ایسی رکاوٹیں کہ دور کرنا چاہے تو نہ کرسکے، تو یہ چیز ایسی ہے کہ کل کے بارے میں آدمی کیا کرے گا کوئی نہیں جانتا، آدمی اپنے طور پر فیصلے کرتا ہے، ارادے کرتا ہے، پلاننگ کرتا ہے، لیکن اللہ کے ایسے فیصلے ہوتے ہیں کہ ساری پلاننگ دھری رہ جاتی ہے، ملکوں کے پیمانوں پر بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، جماعتوں کے پیمانوں پر بھی مثالیں موجود ہیں، افراد کے پیمانے پر بھی موجود ہیں، ہر آدمی اپنی زندگی میں دیکھے تو ایسی بہت سی چیزیں اس کے سامنے آئیں گی کہ اس نے سوچا کچھ تھا اور اس کے بعد عملاً اس کا نتیجہ کچھ نکلا۔

موت کا علم

پانچویں بات فرمائی: ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِأَیِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ یعنی کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی، یہ بھی ایسی حقیقت ہے، آدمی کیا کیا تمنائیں کرتا ہے، لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کا حکم ہوتا ہے، البتہ جائز تمنا کرنے کا حکم بھی ہے کہ انسان تمنا کرسکتا ہے، مثلاً: کوئی انسان تمنا کرے کہ مدینہ میں اس کا انتقال ہو تو درست ہے، اس سلسلہ میں ایک مشہور دعا بھی منقول ہے:

"واجعل موتی فی بلد حبیبك"

(اے اللہ! میری موت اپنے حبیب کے شہر میں مقدر فرما)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمنا سے کچھ نہیں ہوتا، فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، آدمی تمنا کچھ بھی کرے، جس کے بارے میں اللہ نے جہاں لکھ دیا وہیں پر آئے گی، اس کے ایسے عجیب وغریب قصے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، آدمی زبردستی اصرار کرکے وہاں جاتا ہے، ہزار باتیں کرکے اور ہزار بہانے کرکے جاتا ہے کہ وہاں جانا بہت ضروری ہے، اور وہ نہیں جانتا کہ درحقیقت موت ہم کو وہاں لے جارہی ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کا قصہ بڑا مشہور ہے کہ ایک آدمی ان کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے، آپ مجھے بھجوا دیجئے، چونکہ ان کے پاس وہ ہوائی جہاز تھا جو مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرلیتا تھا، اس لیے اس شخص نے ان سے مطالبہ کیا، ہمارے اس دور میں بھی دیکھا جائے تو اب سے دو سو اور سو سال پہلے اگر آپ دلی جانا چاہتے تو مصیبت تھی، پندرہ بیس دن سے کم نہیں لگتے تھے، اور اگر آپ حجاز جانا چاہیں تب تو بہت لمبا وقت چاہیے، لیکن اب یہ سہولت ہے کہ آپ جہاز پر بیٹھیں اور حجاز پہنچ جائیں، آپ نے یہاں فجر پڑھی اور ظہر حرم میں پڑھی، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دیا تھا کہ ان کا تخت ایسا تھا کہ اس میں انسان بیٹھے اور ہوا کے دوش پر اڑتا چلا جائے، اس سے مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے ہوجاتی تھی، چنانچہ ایک اللہ کا بندہ ان کے پاس گیا، اور کہنے لگا کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے، بڑا شدید تقاضا ہے اور بہت ضروری کام ہے، لہٰذا آپ بھجوا دیجئے، جب اس نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے کہا: جاؤ ٹھیک ہے، بس وہ وہاں پہنچا اور جیسے ہی پہنچا تو ملک الموت پہنچ گئے، اور ملک الموت نے کہا کہ میں سوچ رہا تھا کہ تم یہاں بیٹھے ہو اور اللہ کا حکم یہ ہے کہ فلاں جگہ میں تمہاری روح قبض کروں، میری سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ فلاں جگہ تم کیسے ملو گے، لیکن اب سمجھ میں بات آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر ایسا تقاضا ڈالا کہ تم اصرار کرکے عام حالات سے ہٹ کر حضرت سلیمان کے معجزہ کو استعمال کرکے یہاں

آ گئے، بس اللہ تمہیں لایا، کیونکہ تمہیں یہاں پر موت آنی تھی۔

اس قبیل کے بہت سے دیگر واقعات بھی ہیں، آدمی کیا کیا سوچتا ہے، اور پتہ نہیں کیا ہوتا ہے، سوچتا ہے کہ موت فلاں جگہ آئے گی، اور آتی کہیں اور ہے، تو یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے، اللہ نے یہ چیزیں اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمی کی تمنا پوری کر دیتا ہے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آدمی جہاں سوچے وہیں موت آجائے، موت تو اللہ کے حکم سے آتی ہے اور اللہ جہاں چاہتا ہے وہاں آتی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے چھپا دیا ہے، اگر وہ موت کو نہ چھپاتا تو لوگ پھر آرام سے بیٹھے رہتے، ساری برائیاں کرتے اور سوچتے کہ ابھی بہت وقت ہے، جب موت آنے والی ہوگی تو توبہ کرلیں گے، اس طرح امتحان نہ ہوتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے موت کو چھپایا تاکہ انسان اچھے اعمال کرے، سمجھے کہ ہماری موت ابھی آنے والی ہے، ابھی گھنٹہ میں آجائے، منٹوں میں آجائے، اس کا کوئی پتہ نہیں، ایسا ہوتا بھی ہے، آدمی بیٹھا ہوتا ہے اور فورا چل بستا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ارے ابھی ہنس رہے تھے، ابھی بول رہے تھے، ابھی بیٹھے تھے، اور ابھی چلے گئے، حقیقت میں یہ اللہ کا نظام ہے، اللہ جب چاہتا ہے، فیصلہ ہو جاتا ہے، اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہر نماز میں سوچو کہ یہ تمہاری آخری نماز ہے، جب آدمی یہ سوچے گا تو نہایت استحضار والی نماز ہوگی، ایسے ہی ہر خیر کے کام میں بھی آدمی سوچے کہ خدا جانے شام تک ہم رہیں گے یا نہیں رہیں گے، تو جتنا کام کرنا ہے آدمی کرلے، جب ہر شخص کو اپنی موت کا یہ تصور قائم ہوگا، آدمی یہ سوچے گا کہ موت ہماری کبھی بھی آسکتی ہے، تو اس کی تیاری کرے گا، اور اگر یہ معلوم ہوگا کہ ہماری عمر تو ایک سو دس سال ہے، اور ابھی تو بیس سال کا ہوں، بتا دیا جائے اس کو کہ تمہاری موت ایک سو دس سال کی عمر میں آئے گی، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ آدمی پھر جس طرح چاہے گا زندگی گزارے گا، بالکل آزاد رہے گا، سوچے گا کہ ابھی تو بہت وقت ہے، دو چار سال پہلے توبہ کر کے اچھائیاں

کر لیں گے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ چیز چھپالی ہے، تاکہ آدمی ہمہ وقت تیار رہے، سوچے کہ ہماری موت کب آئے گی، ہم کو پتہ نہیں، جب پتہ نہیں تو ہم اس کے لیے جتنا ہو سکے تیار رہنا چاہیے، ایسی صورت حال میں آدمی زیادہ سے زیادہ اعمال خیر کرتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ بعض عجیب طبائع ہوتے ہیں کہ ان کو بتا بھی دیا جاتا ہے کہ تمہاری موت فلاں وقت آنے والی ہے، تب بھی ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ گناہوں سے نہ بچیں، تو ان کے لیے مصیبت ہی آجاتی، اللہ کہتا کہ تمہیں پتہ تھا کہ فلاں وقت تمہاری موت آنے والی ہے، اس کے بعد بھی تمہاری یہ حالت ہے، تو ان کے لیے یہ سخت وبال ہو جاتا، اب چونکہ کسی کو پتہ نہیں ہے تو آدمی اللہ کے سامنے ایک عذر یہ پیش کر سکتا ہے، حالانکہ عذر چلے گا نہیں، لیکن بہر حال ایک ہلکا پن تو آجاتا ہے، اس لیے اللہ نے اس کو چھپا دیا ہے، اس کو کوئی نہیں جانتا، اور کہاں مرے گا یہ بھی کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں چیزیں مخفی رکھی ہیں۔

دعوت توحید کا ایک انمول نمونہ

﴿يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ☆مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلاَّ أَسْمَاء سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَآؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ أَمَرَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَـكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُونَ﴾ (یوسف: ۳۹-۴۰)

(اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کئی معبود جدا جدا بہتر ہیں یا ایک اکیلا اللہ جو زبردست ہے، تم اللہ کو چھوڑ کر جس کو پوجتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے اس کی کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو صرف اللہ کی ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں)

حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل میں اپنے ساتھیوں کو دعوت دی تھی، توحید کی بات سمجھائی تھی، اس آیت میں اسی کا ذکر ہے، یہ قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے کہ ان کے جیل کے دو ساتھی ان کے پاس خواب کی تعبیر پوچھنے آئے تھے، تو انہوں نے کہا کہ ہاں، خواب کی تعبیر تو تمہیں ضرور بتائیں گے، لیکن ابھی کھانا آنے والا ہے، وہ کھانا آجائے، اس کے بعد ہم بتادیں گے، اب یہ جو بیچ کا وقت ان کو ملا، اس کا انہوں نے استعمال کیا، وہ جانتے تھے کہ یہ مشرک ہیں، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام

نے ان کے سامنے دعوت پیش کی، اور یہ اصول ہوتا ہے کہ آدمی کی جب ضرورت کسی سے متعلق ہوجاتی ہے، تو اس کی بات آدمی توجہ سے سنتا ہے، اب وہ دونوں لوگ خواب کی تعبیر پوچھنے آئے تھے، تو انہوں نے کہا: میں ضرور بتاؤں گا، لیکن کچھ دیر بعد بتاؤں گا، گویا ان سے ان دونوں کی ضرورت متعلق ہوگئی، تو اس لیے ان کو توجہ بھی ہوئی، جس سے حضرت یوسف علیہ السلام نے فائدہ اٹھایا اور ان کے سامنے دعوت پیش کی، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے لوگ جو تمہاری بات سن سکتے ہیں، تمہاری طرف متوجہ ہیں، ان کو مت چھوڑو، ان کو صحیح بات بتاؤ، توحید کی دعوت دو، جو بھی ان سے غلطیاں ہو رہی ہیں، ان کی طرف ان کو متوجہ کردو کہ یہ گناہ ہیں جو تم سے سرزد ہو رہے ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرو، غرض کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور فرمایا کہ میرے جیل کے ساتھیو! سوچو تو کہ متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ، جو ایک بھی ہے اور زبردست بھی ہے، غالب بھی ہے، پوری طرح ساری طاقت اس کے پاس ہے، انہوں نے یہ سوال اس لیے کیا تا کہ ان کے ذہن میں ایک تجسس پیدا ہو، سوچنے کی ایک صلاحیت پیدا ہو، وہ غور کریں کہ واقعۃً یہ جو طریقہ ہم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے، یہ صحیح ہے یا غلط، اس کے بعد فرمایا کہ تم جن کی عبادت کرتے ہو، وہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے اس کی کوئی دلیل نہیں اتاری، جن لوگوں کو تم پوجتے ہو، ان کی کیا حقیقت ہے؟ بس تم نے اپنی طرف سے ان کو گڑھ لیا کہ گویا تمہارے دیوی دیوتا ہیں، تمہارے معبود ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری، اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود ہے، اس کے سوا کسی کے پاس طاقت ہے، جب اللہ نے یہ بات نہیں کہی اور اسی کے پاس سب کچھ ہے، تو اپنی طرف سے تم نے جو چند نام رکھ لیے ہیں، اور تم ان کو پوجتے ہو، ان کو تم خدائی میں شریک کرتے ہو، یہ تمہارے لیے کہاں تک درست ہے؟ جب کہ حکومت صرف اللہ کے لیے ہے، سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ صرف

اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، سیدھا راستہ یہ ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے، اسی کی عبادت کی جائے، اسی کے آگے سر جھکایا جائے، لیکن لوگ نہیں جانتے، اور خدا جانے کہاں کہاں وہ سر مارتے ہیں، اور کن کن لوگوں کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں، اور ان کے سامنے جا کر اپنی ضرورتوں کو رکھتے ہیں، تو لوگوں کے نہ جاننے کا یہ نتیجہ ہے، لیکن اگر لوگ غور کریں اور سوچیں تو پھر ان کو وہ سرا مل سکتا ہے، اگر نہیں سوچیں گے تو جو غلط راستہ ہے اسی پر وہ چلتے رہیں گے۔

آپ ﷺ کی بشریت

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاء رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدا﴾ (الكهف: ١١٠)

(کہہ دیجیے کہ میں تو تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، میرے پاس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے، بس جو اپنے رب سے ملاقات کی آرزو رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اچھے ہی کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو بھی ساجھی نہ ٹھہرائے)

اس آیت میں آپ ﷺ نے اس کی صراحت کردی کہ میں بشر ہوں، ایک انسان ہوں، فرق یہ ہے کہ میرے پاس اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، اور وحی یہ آتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے، اس آیت سے بات بالکل صاف ہوگئی، بہت سے لوگ جو تصور کرتے ہیں کہ آپ ﷺ بشر نہیں ہیں یہ غلط ہے، اس آیت سے بالکل صراحت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ ﷺ بشر ہیں، اور دوسری بات یہ کہ آپ ﷺ کو نمونہ بنایا گیا، اسوہ بنایا گیا، اور قرآن مجید میں یہ بات کہی گئی کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے، اور نمونہ جو ہوتا ہے، وہ اسی وقت نمونہ بن سکتا ہے کہ جب اپنا جیسا آدمی ہو، اگر اپنا جیسا نہیں ہے، اپنی جنس کا نہیں ہے تو وہ نمونہ نہیں بن سکتا، اس میں آدمی عذر کرسکتا ہے کہ یہ تو فلاں جنس سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے بس میں وہ ہے جو ہم نہیں کرسکتے، لیکن اگر ایک

انسان ہی وہ کام کر رہا ہے تو کہا جاتا ہے کہ جب وہ انسان یہ کام کر رہا ہے تو تم بھی کر سکتے ہو، اس کے برخلاف اگر کوئی فرشتہ کر رہا ہے، یا کوئی جن کر رہا ہے تو اس کو دلیل نہیں بنا سکتے کہ وہ کام کر رہا ہے تو تم بھی کر سکتے ہو، لیکن اگر ایک انسان کوئی کام کر رہا ہے تو انسانوں کے لیے وہ نمونہ بن سکتا ہے، تو آپ ﷺ کو جو نمونہ بنایا گیا اس میں حکمت بھی یہی تھی کہ آپ ﷺ کو اللہ نے انسان بنایا، بشر بنایا، تا کہ آپ ﷺ کا نمونہ اختیار کرنا آسان ہو، نفسیاتی طور پر بھی آسان ہو، اور عملی طور پر بھی آسان ہو، اگر آدمی دوسرا نمونہ پیش نظر رکھے، تو ایک نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے کہ یہ تو فرشتے ہیں یا یہ جن ہیں، یہ فلاں کام کر رہے ہیں، وہ کام ہم نہیں کر سکتے، کیونکہ انسانوں کے اندر اللہ نے ویسی طاقت ہی نہیں رکھی، لیکن جب کوئی انسان کام کرتا ہے تو آدمی سوچتا ہے کہ ہاں یہ کام ہم بھی کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ایک انسان جس کو اللہ نے پیدا کیا وہ کر رہا ہے، تو اللہ تبارک وتعالی نے ہم کو انسانوں میں ہی بنایا، یہ کام ہم بھی کر سکتے ہیں، غرض کہ نمونہ آدمی کے لیے جب ہی ہوتا ہے جب اپنی جنس کا ہو، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو اسی لیے انسانوں میں پیدا فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بات فرمائی بھی ہے کہ اگر ہم آپ کو فرشتہ بناتے تو بھی ان کو اشتباہ ہوتا، پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ انسانی شکل میں کیوں ٹہل رہے ہیں، اسی لیے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ فرشتے نہیں یہ تو انسان ہیں، یہاں تک کہا گیا کہ قرآن مجید ہم اتار بھی دیتے اور دو فرشتے اس کو لے کر بھی آجاتے، تب بھی لوگ شبہ کرتے، کیونکہ شبہات والے جو ہیں وہ گویا یہ بات طے کر لیتے ہیں کہ ہم کو بات نہیں ماننی ہے، ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے، لیکن اللہ جس کے لیے راستہ کھولتے ہیں، اس کے لیے راستہ کھلتا ہے، مگر راستہ جبھی کھلتا ہے جب آدمی دل میں نرمی پیدا کرے، اور بات جو بھی کہی جارہی ہے اس کے بارے میں غور کرے، غور کرنے کی اللہ نے جو صلاحیت رکھی ہے اس کا استعمال کرے، پہلے ہی مرحلہ میں آدمی جمود اختیار کر لے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید

میں کئی جگہ یہ بات کہی کہ جن لوگوں نے کفر طے کرلیا، ان کے لیے ہر بات برابر ہے، آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، یہ ماننے والے نہیں، جنہوں نے ایک بات طے کر لی کہ ہم کو نہیں ماننا تو ان کو آدمی کتنا ہی کہے یہ نہیں مانیں گے، اسی لیے اس کی مثال دی جاتی ہے کہ اگر آدمی کوئی سو رہا ہے، آپ اس کو جگائیے وہ جگ جائے گا، لیکن کوئی سوتا بنا ہوا ہے، تو آپ کتنا ہی جگائیے وہ نہیں اٹھے گا اور سوتا بنا رہے گا، تو جو کوئی بات طے کر لیتا ہے، اس کو سمجھانا بڑا مشکل ہے، جو سوتا بنا ہوا ہے اس کو جگانا بہت مشکل ہے، جس نے طے کرلیا کہ ہم کو نہیں ماننا، آپ کتنا ہی سمجھائیے، اس نے جب ایک بات طے کر لی ہے کہ ہم کو نہیں ماننا ہے، اس کے سمجھ میں آ رہا ہے لیکن کہتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، ایسے ہی یہودیوں کا حال تھا وہ آپ ﷺ کو ایسے ہی پہچانتے تھے جس طرح آدمی اپنی اولاد کو، اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے، لیکن انہوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ ان کو ماننا نہیں ہے، بہت سی حدیثوں میں بھی اس کی مثالیں آتی ہیں، وہ لوگ آپ ﷺ کے پاس آتے تھے، ایسی باتیں کہتے تھے، یہاں تک کہتے تھے کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آپ نبی ہیں، آپ ﷺ کہتے تھے کہ جب یہ یقین ہو گیا تو گواہی کیوں نہیں دیتے، مانتے کیوں نہیں، تو کہہ دیتے کہ مانیں گے نہیں، اس لیے کہ نبی بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں کیوں آ گیا، یہ نبوت تو ہماری جاگیر تھی، ہم سے یہ دولت چھن گئی تو ہم ماننے والے نہیں، ہمیں یقین ہے کہ آپ نبی ہیں، لیکن ہم نہیں مانیں گے، یہ ان کے اندر جحود کی کیفیت تھی، جب جحود کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں آدمی نہیں مانتا، تو وہ ایک الگ مسئلہ ہے، اور اگر آدمی غور کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس کو ہدایت عطا فرماتے ہیں۔

منہج دعوت

”عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: لَمَّا بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ نَحْوَ أَهْلِ الْيَمَنِ، قَالَ لَهُ: إِنَّكَ تَقْدَمُ عَلٰى قَوْمٍ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، فَلْيَكُنْ أَوَّلَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلٰى أَنْ يُوَحِّدُوا اللّٰهَ، فَإِذَا عَرَفُوا ذٰلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي يَوْمِهِمْ وَلَيْلَتِهِمْ“(١)

(حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا: تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں، لہٰذا تم ان کو سب سے پہلے خدا کو ایک ماننے کی دعوت دینا، جب وہ اس کو سمجھ لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں)

مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد جب حالات ساز گار ہو گئے تو جہاں جہاں سے تقاضے آئے اور جہاں جہاں آپ ﷺ نے ضرورت محسوس کی، ان علاقوں میں صحابہ کرام کو بھیجا، اور جانے والوں کو آپ ﷺ نے وہاں کے حالات کے اعتبار سے نصیحتیں بھی فرمائیں، مذکورہ حدیث جو کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اس میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے یمن بھیجنے کا تذکرہ ہے، حضرت معاذؓ بن جبل جلیل القدر صحابی ہیں، ان کے بارے میں خود آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی

(١)البخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی دعاء النبی ﷺ أمته الی توحید اللّٰه: ٧٣٧٢

کہ یہ حلال وحرام کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، آپ ﷺ نے ان کو یمن بھیجا تھا، جس وقت وہ تشریف لے جارہے تھے، اس وقت آپ ﷺ نے ان سے نصیحت کے طور پر یہ بات فرمائی کہ تم ایسے لوگوں کے پاس جارہے ہو جو اہل کتاب ہیں، اور اہل کتاب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ تم ان کو توحید کی دعوت دینا، توحید کی طرف بلانا جو ہر چیز کی بنیاد ہے، عقائد کی بنیاد ہے اور اس کے بعد اعمال کی بنیاد بھی ہے۔

دعوت کا پہلا اصول

آپ ﷺ نے اس نصیحت میں ان کو حکمت کی ایک بات بتائی جس کا سمجھنا ایک داعی کے لیے نہایت ضروری ہے، اس حدیث میں آپ ﷺ سے دعوت کی حکمت کا یہ طریقہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب بھی کہیں دعوت کی بات کہے تو اس میں تدریج وترتیب اختیار کرے، ساری باتیں ایک ساتھ پیش نہ کی جائیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو نامانوس باتیں ہوتی ہیں ان کا فوراً قبول کر لینا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب آدمی مانوس ہو جاتا ہے تو ان کا قبول کرنا آسان ہوتا ہے، اس لیے تمام دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک اصولی بات ہے، چاہے کوئی شخص مشرکین میں کام کرے، اہل کتاب میں کام کرے، یا مسلمانوں میں کام کرے، جو لوگ بھی اصلاح ودعوت کا کام کرتے ہوں، ان سب کے لیے اس حدیث میں یہ حکمت ہے کہ دعوت کے کام میں تدریج اختیار کی جائے، سارا بوجھ اکٹھا نہ لادا جائے، اگر سارا بوجھ اکٹھا لادا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر آدمی اس کے بارے میں سوچے گا کہ یہ ہم کر بھی سکیں گے یا نہیں؟ وہ سوچے گا کہ اتنی باتوں پر عمل کرنا مشکل ہے، لیکن جب ایک مرتبہ آدمی مانوس ہو جائے گا اور ایک چیز کو اچھی طرح سمجھ لے گا تو دوسری بات اس کو قبول کرنے میں سہولت ہوگی، معلوم ہوا دعوتی کام میں تدریج اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور یہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ ایک ایک بات کہی جائے، جب مخاطب ایک بات سے

مانوس ہو جائے پھر دوسری بات کہی جائے۔

دعوت کا دوسرا اصول

مذکورہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی کام میں تدریج کے ساتھ ترتیب بھی اختیار کی جائے، جو چیزیں زیادہ ضروری ہیں اور زیادہ اہم ہیں، ان کو پہلے مرحلہ پر بیان کریں، جو چیزیں کم اہم ہیں ان کو اسی ترتیب سے درجہ بدرجہ بیان کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ غیر اہم کا پہلے تذکرہ ہو اور اہم چیزوں کا بعد میں تذکرہ ہو، کوئی کسی شرک والے کے پاس جائے اور بجائے توحید کی دعوت دینے کے اس کو سب سے پہلے نماز یا اعمال کی دعوت دے تو یہ ترتیب نامناسب ہے، اس لیے کہ اعمال کی بنیاد عقائد پر ہے اور عقائد کی بنیاد توحید پر ہے، لہٰذا سب سے پہلا مرحلہ توحید کا ہے، اس حدیث میں ایک طرف آپ ﷺ نے تدریج بیان فرمائی ہے اور دوسری طرف ترتیب بھی بیان فرمائی کہ جو سب سے اہم چیز ہو اس کو سب سے پہلے بیان کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ اہم وہ چیز ہے جو بعد میں آنے والی چیزوں کی بنیاد ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اہم چیز توحید ہے، توحید کا عقیدہ صحیح ہے تو باقی تمام چیزیں صحیح ہوں گی، اس لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں، تدریج بھی ضروری ہے اور ترتیب بھی، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس کو قبول کرتا ہے، اس پر عمل کرنا اس کو آسان ہوتا ہے، ورنہ جو چیزیں اجنبی ہوں، جن سے آدمی مانوس نہ ہو اگر وہ سب اکٹھا کہی جائیں تو آدمی ان کو بوجھ محسوس کرتا ہے، قرآن مجید کا اسی لیے طریقہ دعوت یہ ہے کہ جو احکامات پیش کیے جاتے ہیں، اول تو وہ نرے احکامات نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس میں جو اس کا ترغیبی پہلو ہے وہ بھی ذکر کیا جاتا ہے، گویا جو دوا دی جاتی ہے وہ شکر میں لپیٹ کر دی جاتی ہے، اندر سے کڑوی ہے، لیکن اوپر سے میٹھی ہے، تاکہ اس کا لینا آسان ہو، اگر کڑوی دوا نری کڑوی ہوگی تو اس کا حلق سے نیچے اتارنا دشوار ہوتا ہے، اس لیے پہلے یہ کوشش کی جائے کہ جو بات بھی کہی جائے تدریج کے ساتھ کہی جائے، دوسرے یہ کہ اس میں ترتیب کا لحاظ

رہے، لہٰذا جو اہم بات ہے وہ پہلے کہی جائے۔

دعوت کا تیسرا اصول

تدریج وترتیب کے ساتھ ایک اور اہم بات ہے جو ہمیں قرآن مجید سے معلوم ہوتی ہے، اس کا خاص لحاظ رکھا جائے، وہ یہ کہ جو بات کہی جائے بہتر طریقہ پر کہی جائے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (النحل: ۱۲۵)

(اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاتے رہیے اور اچھے طریقہ پر ان سے بحث کیجیے)

صاف صاف قرآن مجید میں کہہ دیا گیا کہ دعوت کے طریقہ میں نرمی اختیار کی جائے، اگر داعی ایک بات کہے گا اور اس میں کچھ سختی اختیار کرے گا تو اس کا اثر نہیں ہوگا، لیکن وہی بات اگر اپنائیت اور نرمی کے ساتھ کہے گا تو بات مؤثر ہوگی، اس لیے کہ آدمی کا مزاج یہ ہے کہ وہ سختی اور بڑائی پسند نہیں کرتا، اگر بات کہنے والا ذرا بھی یہ ظاہر کرے کہ وہ اوپر ہے اور مخاطب نیچے، تو وہ بات مؤثر نہیں ہوتی، اس لیے داعی یہ کبھی نہ سمجھے کہ ہمارے پاس علم ہے اور جس سے ہم کہہ رہے ہیں یہ بے عمل ہے، جاہل ہے، یہ ہم سے بہت نیچا ہے، ہم تو اس سے ہر طرح خطاب کر سکتے ہیں، وہ ہمارا چھوٹا ہے، اگر یہ بات ذہن میں آئی تو اول تو اصول کے خلاف بات ہے، ہر آدمی کو سمجھنا چاہیے کہ ہم میں کتنی کوتاہیاں ہیں، اور دوسرے یہ کہ دعوت کا عمل پھر غیر مؤثر ہو جاتا ہے، اس کی تاثیر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے کو کم سمجھے، مخاطب کی اہمیت اس کے ذہن میں ہو، اور یہ سمجھے کہ جب مخاطب سے محبت کے ساتھ کہا جائے گا، اپنائیت سے کہا جائے گا، تو اس کا اثر پڑے گا اور اگر اس میں اپنائیت نہیں ہے تو پھر بات مؤثر نہیں ہوگی، دعوت کا کام خواہ آپ اپنوں میں کریں یا غیروں میں ہر میدان میں یہی صورت حال ہے، ہر جگہ کا یہ

بنیادی اصول ہے کہ تدریج وترتیب ہواور بات نرمی اور محبت کے ساتھ کہی جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

تیسری بات جو قرآن مجید اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ سے معلوم ہوتی ہے، وہ ہے برائی پر نکیر کرنا، سیرت نبوی ﷺ میں واقعات دیکھو تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح آپ ﷺ انکار منکر فرماتے تھے، یہ بھی لازم ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ انکار منکر نہ کیا جائے تو ظاہر ہے دین ناقص ہو جائے گا، اس لیے کہ قرآن مجید میں دونوں باتیں ہیں، ﴿يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾ کے ساتھ ﴿يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ کا ذکر ہر جگہ ملے گا، آپ ﷺ کی سیرت طیبہ میں اس کا پورا نمونہ موجود ہے، لیکن "أمر بالمعروف" اور "نهي عن المنكر" کس طرح ہو، یہ باتیں ہمیں سیرت سے معلوم ہوتی ہیں، سیرت میں جو واقعات سامنے آتے ہیں، ان میں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ کہیں حکم دیتے ہوں، بلکہ آپ ﷺ اس کام کی فضیلت بیان فرماتے تھے، اس کی اہمیت بیان فرماتے تھے، عام طور پر یہ نہیں فرماتے تھے کہ فلاں تم ایسا کرلو، بلکہ فرماتے تھے کہ فلاں کام بڑا مفید ہے، بڑا مناسب ہے، اس کے یہ فضائل وفوائد ہیں، تاکہ آدمی کے اندر خود دلچسپی ورغبت پیدا ہو جائے۔

مؤثر طریقہ دعوت

معلوم ہوا دعوت کا مناسب طریقہ ہر جگہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے، آدمی دوسرے کی نفسیات سمجھے اور اس کے اعتبار سے اس کو خطاب کرے، وہ جذبات مجروح نہ کرے بلکہ وہ اس اپنائیت سے مخاطب کرے کہ وہ داعی کو اپنا سمجھے، جب آدمی ایک مرتبہ اپنا سمجھتا ہے تو اس کے بعد بات بڑی آسان ہو جاتی ہے، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب بھی تم کسی سے بات کرنا چاہو تو کھلے دروازہ سے جاؤ، کبھی بھی بند دروازہ کو زبردستی کھولنے یا توڑنے اور زبردستی کھلوانے کی کوشش نہ کرو، اس لیے کہ جب تم کھلے دروازے سے جاؤ گے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تم اس کے اپنے بن جاؤ گے،

تمہارے اندر اپنائیت پیدا ہو جائے گی، تم جس سماج میں جاؤ گے وہ تم کو اپنا سمجھے گا، اور جب اپنا سمجھے گا تو تم جو بات بھی کہو گے تمہاری بات توجہ سے کان لگا کر سنی جائے گی کہ اپنا آدمی کہہ رہا ہے، اور جہاں اجنبیت کا احساس ہوا تو بات مؤثر نہیں ہوگی۔

دعوت کی راہ کا کھلا دروازہ یہ ہے کہ آدمی کہیں پر بھی بات کرنے جائے تو سب سے پہلے جن لوگوں کو مخاطب کرنا ہے ان کے مزاج کو سمجھے، وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں؟ ان کے کیا طریقے ہیں؟ ان کی کیا خصوصیات ہیں؟ اس کو سمجھ لے، اس کے بعد جب آدمی جا کر بات کرے تو ان باتوں کا دھیان رکھے، اور جو چیزیں ان کی ذرا بھی بھلائی اور خیر کی ہوں، پہلے ان چیزوں کا تذکرہ کرے تا کہ وہ لوگ مانوس ہو جائیں، وہ یہ سمجھیں کہ یہ ہماری خوبیوں سے واقف ہیں، ایسا نہیں ہے کہ یہ ہم کو نہیں جانتے، پھر دوسری بات یہ کہ مخاطبین سے تعلق کا اظہار کیا جائے، اگر ذرا بھی کوئی تعلق داعی کا مخاطبین سے ہو تو اس رشتہ کو ضرور بیان کرے کہ آپ سے تو ہمارا بڑا گہرا تعلق ہے، آپ تو ہمارے وطن کے ہیں، ہمارے علاقہ کے رہنے والے ہیں، ہماری قوم کے ہیں، غرض جو بھی رشتہ ہو سکے اس کا اظہار کرے، کیونکہ اس سے اپنائیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے، پھر دعوت کا کام بڑا آسان ہو جاتا ہے، اگر دروازہ نہیں کھلا تو بڑی دشواریاں آئیں گی، آپ زبردستی کریں گے تو اس کا یہ نقصان ہے کہ آپ جو آگے خیر کی بات کہنے والے ہیں آدمی اس کو قبول نہیں کرے گا اور اجنبی سمجھے گا، اور ایسی صورت میں بات مؤثر نہیں ہوگی، تو جو دعوت کا کام کرنے والا ہو وہ کہیں بھی کام کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ان پہلوؤں کو مد نظر رکھے، اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت طیبہ میں ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں اس طرح کی موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے کس طرح دعوت دی، آپ ﷺ نے لوگوں کو کس طرح سمجھایا، یہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں، اور مذکورہ حدیث میں بھی ہمیں بڑی حکمت کی باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ ترتیب و تدریج اختیار کی جائے اور بہتر طریقہ بھی

اختیار کیا جائے، یہی قرآن مجید کی بھی تعلیم ہے۔

دعوت توحید کی حکمت

مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے اہل کتاب کو توحید کی دعوت دینا، دعوت توحید پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ایک تو جو ترتیب ہے، اس کے لحاظ سے فرمارہے ہیں، اس لیے کہ سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک مشترک پوائنٹ ہے، جس پر جمع ہونے کی دعوت دی جارہی ہے، سابقہ سطور میں اس سلسلہ کی قرآنی آیت گذر چکی ہے جس میں اہل کتاب کو کلمہ سواء پر آنے کی دعوت دی گئی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾

(آل عمران: ٦٤)

(آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے (وہ یہ) کہ ہم صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنالے پھر اگر وہ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں)

اگر اس آیت کو آپ سامنے رکھیں تو اور زیادہ حقیقت کھل جائے گی کہ آپ ﷺ ان کو سب سے پہلے مرحلہ پر ہی توحید کی دعوت دینے کی جو بات فرمارہے ہیں وہ اس لیے کہ وہ اس بات کے کسی نہ کسی درجہ میں قائل تھے، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کا ان کو دعوی تھا کہ ہم توحید کے ماننے والے ہیں، ہم ایک اللہ کے ماننے والے ہیں، جب اس بات کا ان کو دعوی ہے، تو گویا یہ وجہ مناسبت ہے، یہ وہ اشتراک ہے کہ جب

آپ اس کا تذکرہ کریں گے تو ان کے اندر ایک تجسس وخیال پیدا ہوگا، اور یہ چیز ان کے ذہن میں آئے گی کہ یہ لوگ بھی کوئی الگ نہیں ہیں، یہ وہی بات کہہ رہے ہیں جس کے ہم قائل ہیں، البتہ وہ کس حد تک مانتے ہیں؟ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ وہ ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن جب ان کے سامنے توحید کا نام آئے گا تو یہ ان کو مانوس کرنے کا ایک موضوع بن جائے گا، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے توحید کی دعوت دو، گویا یہاں تدریجی اور ترتیبی مرحلہ یہی تھا اور حکمت بھی اسی میں تھی کہ وہ لوگ (اہل کتاب) توحید کے ماننے والے تھے، تو ان سے توحید کی بات اولاً کہی جائے، جب آپ توحید کی بات کہیں گے تو وہ اس بات کو تسلیم کریں گے۔

مخاطبین کی رعایت

اگر آپ ایسے لوگوں کو دعوت دینے جا رہے ہیں، جیسے ہمارے یہاں برادران وطن ہیں، آپ پہلے مرحلہ ہی میں جائیے اور ان سے کہیے کہ صرف اللہ کو مانو، سب بتوں کو توڑ دو، یہ شرک تمہیں جہنم تک پہنچا دے گا، تو ہوسکتا ہے کہ ردعمل پیدا ہو اور پہلے ہی مرحلہ پر وہ وہ بات سننے سے انکار کردیں، بلکہ یہاں ہوسکتا ہے آپ کو اور لمبی ترتیب اختیار کرنی پڑ جائے، جو توحید سے کوسوں دور ہیں اور شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں، یہاں پہلے مرحلہ میں اگر آپ توحید کی دعوت دے دیں گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ بدک جائیں، لہٰذا آپ یہاں پہلے انسانیت کی بات کہیں، وہ مشترک قدریں جو ان میں اور آپ میں ہیں ان کا تذکرہ کریں، جب ان کا تذکرہ ہوگا تو ان کے دل ودماغ کھلیں گے، گویا یہاں یہ کھلا دروازہ ہے، جب دروازہ کھل جائے گا تو آپ اندر جائیں گے، پھر آپ ان کو بتائیے کہ توحید ورسالت کیا ہے، اور تفصیلات کیا ہیں، لیکن آپ جو پہلا مرحلہ اختیار کریں گے اس میں اس ترتیب کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ جو بات ان کے لیے مانوس ہو، پہلے مرحلہ میں وہ بات کی جائے۔

تدریجی مرحلہ میں یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ بات کہی جائے جس سے

مخاطبین مانوس ہوں، پھر جو اہم بات ہے وہ پہلے کہی جائے، ظاہر ہے توحید سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں، لیکن یہاں اس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ اگر پہلے مرحلہ میں توحید کی بات کرنے سے مخاطبین بدکتے ہوں تو ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ ترتیب میں وہ چیز اختیار کی جائے جو ان کے لیے مانوس کن ہو، جب وہ چیز اختیار کرلیں گے تو جو اہم چیز ہے، ان کے لیے اس کا قبول کرنا آسان ہوگا، اور اگر آپ سوچیں گے کہ سب سے اہم یہی ہے، اس کو ہم پہلے بیان کردیں، تو ہوسکتا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے سد راہ بن جائے، اور آگے آپ کو بات کرنا مشکل ہو۔

حکمت کی اہمیت

مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے بہت حکیمانہ باتیں ارشاد فرمادیں، فرمایا کہ توحید کی دعوت دینا، پھر جب وہ اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ لیں اور بہت اچھی طرح جان لیں، تب ان سے بتانا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر پانچ وقت کی نمازیں بھی فرض کی ہیں، معلوم ہوا توحید کا قائل ہونے کے بعد فوراً تمام احکامات نہیں سنانا ہے، اگر کسی نے کلمہ پڑھ لیا پھر اس سے پہلے ہی دن یہ کہا جائے کہ دیکھو ایک مہینہ کے روزہ فرض ہیں، پانچ وقت کی نماز فرض ہے، صاحب نصاب پر سال میں زکاۃ فرض ہے، صاحب حیثیت پر عمر میں حج فرض ہے، تو وہ سوچے گا کہ کیا کیا فرض ہے، ہم کیا کیا کریں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دین کو بوجھل سمجھ کر اس سے بددل ہوجائے گا، معلوم ہوا اس طرح کے انداز دعوت سے ترتیب بگڑ جاتی ہے، مناسب یہ ہے کہ آپ اس کو حکمت سے بات سمجھائیں، پہلے مرحلہ میں ساری باتیں نہ کہیں، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ جب کلمہ پڑھ لیا تو نام بدلنا فوراً ضروری ہے، جب نام ہی نہیں بدلا تو یہ کیسے مسلمان ہوا، حالانکہ یہ بات ترتیب کے خلاف ہے، اور دعوت کے کام میں بہر حال ترتیب کو ملحوظ رکھنا ہوگا جیسا کہ حضور ﷺ نے اس حدیث میں وضاحت فرمائی ہے، ترتیب سے آدمی کسی کو بات سمجھتا ہے تو بات اس کے دل میں اترتی ہے، وہ بات کو اخذ

کرتا ہے، اگر ایک دم سے سب چیز لا دد یجئے تو جو کھلا راستہ ہے وہ بھی بند ہو جائے گا، کوئی چیز بھی اندر نہ جائے گی، لیکن اگر تھوڑی تھوڑی چیز ڈالی جائے تو اگر چھوٹا سوراخ بھی ہے تب بھی کام ہو جائے گا۔

مطلوب کیا ہے؟

مذکورہ حدیث میں دعوت توحید کے بعد آپ ﷺ نے نماز کا جو ذکر فرمایا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز سکھا کر فارغ ہو گئے، بلکہ اس کے بعد اور بھی چیزیں ہیں، نماز کے بعد روزہ بتایا جائے، پھر زکاۃ اور حج کو بتایا جائے، پھر اور معاملات سکھائے جائیں، کیونکہ دین پوری زندگی کا نام ہے، لہٰذا زندگی کا جو بھی طریقہ ہے وہ طریقہ بتایا جائے گا، حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ دو چیزیں بتا دینا کافی ہے، بلکہ یہ مثال کے طور پر دو باتیں فرمائی گئیں، اور ترتیب وحکمت سکھانے کے لیے ان دو چیزوں کا ذکر ہے، ورنہ مراد یہ ہے کہ اسی ترتیب کے ساتھ حکمت وتدریج کا خیال کرتے ہوئے ایک ایک چیز بتائی جائے، تا کہ لوگ اس سے مانوس ہو جائیں اور مکمل دین ان کے اندر پیدا ہو جائے۔

عبد اور معبود کے حقوق

"عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا مُعَاذُ! أَتَدْرِى مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ؟ قَالَ: اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: أَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، أَتَدْرِى مَا حَقُّهُمْ عَلَيْهِ؟ قَالَ: اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: أَنْ لَا يُعَذِّبَهُمْ"(۱)

(حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: معاذ! کیا تم جانتے ہو اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ (پھر فرمایا) کیا تم کو معلوم ہے کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ جواب میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پر بندوں کا یہ حق ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے)

اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ کو خطاب کر کے ایک بات ارشاد فرمائی کہ معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے؟ دراصل آپ ﷺ کا بات پہنچانے اور تربیت کرنے کا یہ ایک طریقہ تھا، اگر آپ ﷺ کو کوئی بات

(۱) البخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی دعاء النبي ﷺ أمته الى توحيد الله: ۷۳۷۳

کہنی ہوتی تھی تو اکثر آپ کو روایات میں یہ بات ملے گی کہ حضور ﷺ پہلے ہی مرحلہ میں وہ بات نہیں کہہ دیتے تھے، بلکہ پہلے متوجہ فرماتے تھے، کیونکہ جب آدمی متوجہ ہو جاتا ہے تو بات کو توجہ سے سنتا ہے، کان لگا کر سنتا ہے، اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا متعدد احادیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: یا معاذ! اور انہوں نے جواب دیا: لبیك یا رسول الله و سعدیك. بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت معاذ بالکل پیچھے بیٹھے تھے یا سواری میں آپ کے پیچھے بیٹھے تھے، یا بالکل سامنے بیٹھے ہوئے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ''اے معاذ'' اور وہ کہہ رہے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں''۔

ظاہر بات ہے کہ جب بار بار خطاب کیا جائے گا تو مخاطب خود سوچے گا کہ پتہ نہیں کیا بات کہی جانے والی ہے، لگتا ہے بڑی اہم بات ہے، اسی لیے آپ بار بار خطاب کر رہے ہیں، چنانچہ یہاں بھی آپ ﷺ نے اسی طریقہ کو اپناتے ہوئے پہلے متوجہ کیا، حالانکہ اگر آپ چاہتے تو سیدھے سیدھے خطاب کر دیتے اور وہ بات آجاتی، آپ چاہتے تو صاف کہہ دیتے کہ بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ بندے اللہ کے ساتھ شریک نہ کریں، اور اللہ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے، ایک یہ طریقہ تھا، لیکن آپ نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ آپ نے فرمایا کہ اے معاذ! تم کو معلوم ہے کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ گویا اس سوال سے کان کھل گئے، دماغ کی کھڑکیاں کھل گئیں، جو بند دروازہ تھا وہ کھل گیا، اب جو اصل بات ہے وہ بات آپ ﷺ فرما رہے ہیں، فرمایا: اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ بندے صرف اللہ کی بندگی کریں، بندے صرف اللہ کی عبادت کریں، اور اس کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ کریں۔

اللہ کا حق

یہ حق بندوں پر اللہ کا ہے، اس لیے کہ اللہ ہی نے بندوں کو پیدا کیا، اسی نے ان کی ضروریات پوری کیں، زندگی دینے والا، ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے، تو کیا

کسی اور کا یہ حق ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو پوجا جائے، کسی کی بندگی کی جائے، گویا جو حق تھا وہ آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ جب سب کچھ اللہ کی طرف سے ملتا ہے تو بندے پر بھی یہ حق ہے کہ وہ بندہ صرف اللہ کو مانے، تنہا اللہ کی بندگی اور اس کی عبادت کرے، اس کے ساتھ ذرا بھی کسی کو شریک نہ کرے، واقعہ یہ ہے کہ اگر اس حدیث پر غور کیا جائے تو اس میں ساری باتیں آگئیں، بندگی میں بندگی کے جو طریقے آپ ﷺ نے بتائے ہیں وہ سب شامل ہیں، بندگی میں صرف عقیدہ شامل نہیں ہے، بلکہ بندگی میں وہ ساری عبادات بھی شامل ہیں جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمائیں، زندگی گذارنے کی دوسری شکلیں بھی اس میں آتی ہیں، جن کو آدمی اختیار کرتا ہے، تو یہ ساری چیزیں بندگی میں شامل ہیں، اردو میں ''عبادت'' کا ترجمہ بندگی سے کیا جاتا ہے، اور خود عبادت کا لفظ بھی اردو میں استعمال ہوتا ہے، جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو بسا اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو ظاہری عبادات ہیں بس وہ اختیار کی جائیں، نماز پڑھی جائے، روزہ رکھا جائے، حج کیا جائے، زکاۃ ادا کی جائے وغیرہ، اور جو زندگی گذارنے کی دوسری شکلیں ہیں، وہ اس میں شامل نہیں سمجھی جاتیں، لوگ ان کو عبادت نہیں سمجھتے، حالانکہ اللہ نے قرآن میں یہ بات فرمائی ہے کہ

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ٥٦)

(اور میں نے انسانوں اور جناتوں کو تو صرف اسی لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں)

یہاں تخلیق کا مقصد عبادت بتایا گیا ہے، عبادت کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہی ہے کہ بندہ نماز، روزہ، زکاۃ اور حج ہی میں مشغول رہے، جو ظاہری عبادات ہیں ان میں لگا رہے، سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ کسی انسان کے لیے ممکن ہے، جو بلوغ کے بعد سے مرنے تک انہیں کاموں میں لگا رہے، نہ کھائے نہ پیئے، نہ اپنے گھر والوں سے تعلق قائم کرے، نہ کہیں آئے نہ جائے، بس نماز پڑھے اور روزہ رکھے، اور جو ظاہری عبادتیں ہیں ان میں لگا رہے؟ ظاہر ہے یہ کسی کے بس میں نہیں ہے، اللہ نے زندگی

دی ہے تو اس کے تقاضے بھی رکھے ہیں، ان تقاضوں کو پورا کرنا انسان کے لیے لازم قرار دیا ہے، اگر کوئی ان تقاضوں کو پورا نہیں کرے گا تو ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا، اگر نہیں کھائے گا، نہیں پئے گا، اپنی دیگر حاجات پوری نہیں کرے گا تو اس کے لیے زندہ رہنا مشکل ہے، اس لیے اللہ نے جو بات فرمائی ہے کہ ہم نے تمہیں بندگی کے لیے پیدا کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو زندگی دی ہے، زندگی کے جو تقاضے رکھے ہیں، زندگی کی جو ضروریات رکھی ہیں اور زندگی کے جو احکامات رکھے ہیں، ان تمام چیزوں میں اللہ کے رسول ﷺ کی تابعداری کرے، آپ نے جس طرح فرمایا اس طرح سے وہ زندگی گذارے۔

عبادت کا مفہوم

عبادت میں دو باتیں ہیں، اگر دو چیزوں کا لحاظ رکھا جائے تو آدمی کی پوری زندگی عبادت ہے، ایک تو یہ کہ آدمی جو کام کرے صحیح طریقہ کے مطابق کرے، صحیح طریقہ کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ کا بتایا ہوا جو طریقہ ہے وہ صحیح ہے، اس کے علاوہ ظاہر ہے آدمی اپنی عقل سے جو طریقہ تجویز کرے گا تو چونکہ عقل ناقص ہے، اس لیے عقل جو تجویز کرے گی اس میں ہزار نقص ہوں گے، عقلیں الگ الگ ہوتی ہیں، ہر عقل کی تجویز الگ ہوگی، اس لیے آپ ﷺ نے جو چیز تجویز فرمادی، جس عمل کو جس طرح تجویز فرمادیا، اس کی جو شکل بیان فرمادی، وہی ہمارے لیے کافی ہونا چاہیے، کیونکہ آپ ﷺ جو بھی فرماتے ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں ہوتا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ☆إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾(النجم: ۲-۳)

(اور وہ خواہش سے نہیں کہتے ☆ وہ تو صرف وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے)

معلوم ہوا آپ ﷺ کا ہر فرمان اللہ کی طرف سے ہے، پھر آپ ﷺ جو بات اپنی عقل سے فرمائیں گے، ظاہر ہے آپ کی جو عقل ہے اس کو اللہ نے جو کمال عطا فرمایا ہے، وہ بھی ایسا ہے کہ اگر ساری دنیا کے عقلاء اکٹھا ہو جائیں، سب انسان اکٹھا

ہو جائیں، ان کی عقلیں ایک پلہ میں رکھی جائیں اور آپ ﷺ کی عقل مبارک ایک پلہ میں رکھی جائے تو آپ کا جو پلہ ہے وہ جھک جائے گا، تو ایک تو یہ ہے کہ آپ کو اللہ نے جو سمجھ دی ہے، اور عقل دی ہے وہ آخری درجہ میں ہے، اور دوسری بات یہ کہ آپ جو بھی فرماتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہوا ہے، اللہ جو فرماتا ہے، جو وحی آتی ہے، آپ وہ فرماتے ہیں، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے ہیں، اور آپ جو اپنی طرف سے کہتے ہیں وہ مؤید من اللہ ہوتا ہے، اور اگر کبھی کوئی بات ایسی ہوتی ہے تو فوراً اللہ کی طرف سے حکم آجاتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں ایسا کر لینا زیادہ مناسب ہے، قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، اس لیے یہ بات طے ہے کہ آپ ﷺ کا جو فرمایا ہوا ہے، وہی شریعت ہے، اور آپ کا جو فرمایا ہوا ہے وہی خیر کی میزان ہے، آپ جو فرمادیں وہ خیر ہے اور آپ جس چیز سے روک دیں وہ شر ہے، گویا بندگی کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو طریقہ آپ ﷺ نے بتایا ہے، ہر کام اسی طریقہ کے مطابق کیا جائے۔

عبادت میں دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے، دونوں باتیں ضروری ہیں، حسن نیت بھی ضروری ہے اور حسن عمل بھی ضروری ہے، اگر ان میں سے ایک چیز میں بھی کمی ہوگی تو نقص ہے، اور دونوں مکمل ہوں گی تب عبادت ہے۔

مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک اللہ کی بندگی کریں، اس میں ساری چیزیں آگئی ہیں، عقائد بھی آگئے، عبادات بھی آگئیں، معاملات و معاشرت کی چیزیں بھی آگئیں، اس کے ساتھ آپ ﷺ نے آگے مزید تاکید کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ "ولا يشرك بـه شيئا" یعنی اللہ کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ ہو، میں سمجھتا ہوں کہ یہاں شرک کی دونوں قسمیں مراد ہیں، اصلاً تو شرک جلی جس کو کہتے ہیں وہ مراد ہے کہ اللہ کی بندگی میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا، کسی سے دعا مانگنا، کسی سے التجا کرنا، کسی کے سامنے امور بندگی انجام دینا، عبادت کے کام انجام دینا، سجدہ کرنا، جیسے نماز میں آدمی کھڑا ہوتا ہے ویسے کھڑا ہونا، کسی کے لیے نذر و

نیاز گذارنا، یہ ساری چیزیں شرک میں شامل ہیں، اسی طرح سے آدمی جو خیر کے کام کر رہا ہے، جو ایمان والا اور توحید کو ماننے والا خیر کے کام کر رہا ہے، اس کو چاہیے کہ ان امور میں اللہ کی ہی رضا کی نیت کرے، اگر وہ دوسرے کی رضا کی نیت کر رہا ہے، دوسروں کو خوش کرنے کے لیے وہ عمل کر رہا ہے تو یہ بھی شرک ہے، لیکن ظاہر ہے یہ شرک جلی نہیں ہے بلکہ خفی ہے، جو شرک جلی ہے وہ ہرگز ہرگز کبھی بھی معاف نہیں ہوتا، اور ایسے شخص کا کوئی بھی عمل اللہ کے یہاں قبول نہیں، جب تک کہ آدمی تائب نہ ہو جائے اور ایمان والا نہ ہو جائے، جب ایمان والا ہو جائے گا تب وہ شرک معاف ہوگا، اور یہ شرک خفی ایسا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو معاف فرمادے اور عمل قبول فرمالے، لیکن اللہ کا نظام بظاہر یہی ہے کہ جب اللہ کے لیے عمل ہوتا ہے تو اللہ قبول فرماتا ہے، اور جب اللہ کے لیے نہیں ہوتا تو اللہ کو غیرت آتی ہے۔

غیرت الٰہی

اللہ تبارک وتعالیٰ کی غیرت کا معاملہ نہایت حساس ہے، اس کو ایک چھوٹی مثال سے یوں سمجھ لیں کہ اگر کسی آدمی کی شادی ہوگئی، اور اس کے بعد اس کا جی چاہا کہ ایک اور شادی کرلے، تو جو پہلی والی بیوی ہے، وہ اس کو کبھی بھی پسند نہیں کرتی کہ کوئی دوسرا شریک بھی اس کے ساتھ آئے، کیونکہ اس کو بھی شرکت پسند نہیں، اسی طرح آپ خود اپنے بارے میں غور کیجیے، آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی آپ کے پاس آئے اور آکر کہے کہ میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں تو آپ کو خوشی ہوگی، لیکن جب آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ آپ سے ملنے نہیں آیا تھا، بلکہ شہر کسی کام سے آیا تھا، اس کو کچھ خریدنا تھا، سوچا کہ آپ سے بھی مل لیں، تو آپ کی خوشی میں کمی واقع ہوجائے گی، اس لیے کہ آپ اس بات کو سمجھ لیں گے کہ وہ تنہا ہم سے ملنے نہیں آیا، بلکہ اپنے کام سے آیا تھا پھر ہم سے بھی مل لیا، اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہم تمام لوگوں کے اندر اللہ نے ایک غیرت رکھی ہے، تو اب غور کرنے کی بات ہے کہ اس غیرت کا پیدا کرنے

والا کون ہے؟ اس غیرت کی اصل کہاں ہے؟ جب ہماری غیرت کا یہ حال ہے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت کا عالم کیا ہوگا، اسی لیے حدیث میں آتا ہے:

"أنا اغنى الشركاء عن الشرك"(١)

(تمام شرکاء میں شرکت سے سب سے زیادہ غیرت مجھے ہے)

"من عمل عملا أشرك معي غيرى تركته و شركه"(٢)

(کوئی بھی اگر ایسا کام کرتا ہے کہ اس میں وہ کسی دوسرے کو میرے ساتھ شریک کر دیتا ہے تو میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں اور اس کے شرک کو بھی)

مذکورہ حدیث حدیث قدسی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جتنے بھی شرکاء ہیں، ان سب سے زیادہ خدا کو غیرت ہے، وہ سب سے زیادہ مستغنی ہے، خدا فرماتا ہے کہ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، تو ایک شرک وہ ہے جس کو شرک جلی کہتے ہیں، وہ تو ایسی خطرناک چیز ہے کہ اس کے بعد نجات کا تصور نہیں، جب تک کہ توبہ نہ ہو، اور ایک شرک خفی ہے کہ آدمی کام کرے لیکن اللہ کی رضا کے لیے نہ کرے، بلکہ دوسرے کی نیت کر لے، تو اللہ کو یہ چیز بھی پسند نہیں ہے، اسی لیے اوپر حدیث میں حضرت معاذؓ سے آپ ﷺ نے فرمایا: "ولا يشرك بــه شيئا" کہ اللہ کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ ہو، اصلاً تو یہاں پر شرک جلی ہی مراد ہے، لیکن غور کیا جائے تو شرک خفی بھی ایک طرح سے مراد لیا جا سکتا ہے۔

بندوں کا حق

حدیث کے دوسرے سے جز سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان بندگی میں مکمل ہے، اس کی پوری زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق گذر رہی ہے، اللہ کی رضا کے لیے سارے کام ہو رہے ہیں، تو اب

(١)صحيح مسلم، كتاب الزهد و الرقاق، باب من أشرك فى عمله غير اللّٰه: ٧٦٦٦
(٢)شعب الايمان للبيهقي: ٦٨٣٦

اللہ تبارک وتعالیٰ پر یہ حق ہوگیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بندہ کو عذاب نہ دے، اب وہ بندہ جہنم میں جا ہی نہیں سکتا، حدیث میں صاف صاف کہا گیا کہ یہ بندہ کا حق ہے کہ بندہ اس طریقہ کو اختیار کرلے، جب وہ اختیار کرلے گا تو اس کے آگے آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے یہ بات فرمائی کہ "أتدری ما حقهم علیه" کیا جانتے ہو کہ اللہ پر بندوں کا کیا حق بن گیا؟ حضرت معاذؓ نے فرمایا: اللہ ورسول زیادہ جانتے ہیں: آپ ﷺ نے فرمایا: "ألا یعذبهم" اب اللہ پر حق یہ ہے کہ بندوں کو عذاب نہ دے، جو بندہ اس طریقہ کو اختیار کرلے گا کہ عقیدۂ توحید بھی اس میں راسخ ہے، عقائد اس کے پورے مضبوط ہیں، اعمال اس کے درست ہیں، فرائض وواجبات کا پابند ہے، حقوق کا ادا کرنے والا ہے، پوری طرح بندگی اختیار کرنے والا ہے، تو یہ بات طے ہے کہ اس کو محنت کا صلہ ملے گا۔

لیکن پہلی چیز یہ ہے کہ انسان حقیقی بندگی کرنے والا ہو، حدیث میں صاف آتا ہے کہ "أن یعبدوہ" یعنی انسان ایک اللہ کی بندگی کرنے والا ہو، اس بندگی میں ساری چیزیں آگئیں، اور پھر یہ بھی آگیا کہ شرک نہ ہو، اور اس میں شرک کی ساری شکلیں آگئیں، تو جو اس طرح زندگی گذارے گا تو ظاہر ہے کہ کیا اب بھی وہ جنت کا مستحق نہیں ہوگا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کیا ایسے شخص کو جہنم میں بھیجے گا؟ وہ تو صاف ستھرا ہوکر اللہ کے یہاں پہنچ رہا ہے، تو ظاہر ہے اللہ پر یہ حق ہے کہ اس بندہ کو عذاب نہ دے، گویا ایک حق بندہ پر ہے اور ایک حق اللہ پر ہے۔

قرآن مجید اور احادیث میں متعدد مقامات پر اس طرح کی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں کہ جو لفظ بندہ کے لیے استعمال ہوا پھر تماثل کے طور پر وہی لفظ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ٥٤)

(اور ان (کافروں) نے چال چلی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور

اللہ ہی سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے)

ظاہر ہے کہ بندہ کے مکر کی نوعیت ذرا مختلف ہے، اور اللہ کے لیے جو مکر کا لفظ استعمال ہوا اس کی نوعیت مختلف ہے، اسی طرح مذکورہ حدیث میں بھی جو حق بیان ہوا ہے، بندے پر جو حق ہے وہ حق لازم ہے، اس لیے کہ بندہ مجبور ہے کہ اسی انداز سے عبادت کرے اور اس حق کو سمجھے، اور جو اللہ پر حق ہے تو ظاہر ہے اللہ مجبور نہیں ہے، وہ مختار ہے، وہ جو چاہے کرے، لیکن جس طرح بندہ نے وفا داری کا ثبوت دیا ہے، تو چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے بڑھ کر حق شناس ہے، خود اپنے آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قدر دان کہا ہے، ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ﴾ (الشورى: ۲۳)

(یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے)

شکر کرنے والے کا مطلب قدر دان ہے، یعنی جو نیکی کی جا رہی ہے، اس کو سب سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھنے والا ہے، تو یہاں پر جو کہا گیا کہ اللہ پر یہ حق ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے بندہ کی پوری قدر فرماتا ہے، اور اس کے اعمال اور اس کی نیکیوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرماتا ہے، اور پھر اس کو نوازتا ہے، اپنے ایسے بندے کو نوازتا ہے جو بندگی کے ساتھ زندگی گذار کر گیا ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے شخص کو جہنم میں نہیں بھیجتے، ورنہ ظاہر ہے بندگی میں جتنی کمی ہوگی، اس کے اعتبار سے اس کو بھگتنا پڑے گا، نمازوں کی پابندی نہیں ہے، فرائض کی پابندی نہیں ہے، اور ایمان والا بندہ ہے، توحید کو مانتا ہے، رسالت وآخرت کو مانتا ہے، عقائد ٹھیک ہیں، البتہ اعمال میں کوتاہی ہے، تو ظاہر ہے پھر اللہ پر یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کو عذاب نہ دے، ہوسکتا ہے کہ وہ عذاب کا شکار ہو، اور کچھ عرصہ اس کو جہنم میں جانا پڑے، اس کے بعد وہ جنت میں بھیج دیا جائے، لیکن جو مکمل بندگی اختیار کرنے والا ہے اس طور پر کہ اس نے ذرا بھی شرک نہیں کیا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے بندہ کو بالکل عذاب نہیں دیتا، اس کو اول وہلہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا۔

نجوم پرستی کی نفی

"عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلّٰى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلاَةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ فِيْ إِثْرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ: هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا: اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: قَالَ؛ أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ، فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ فَذَلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ كَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ، وَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا، فَذَلِكَ كَافِرٌ بِيْ مُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ."(۱)

(حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: ایک رات حدیبیہ میں پانی برسا، صبح کو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ہم سب کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا: لوگوں نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ نے فرمایا کہ آج صبح کے وقت میرے بعض بندے میری قدرت کے قائل ہوئے اور بعض منکر، جنہوں نے کہا: یہ بارش اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوئی، تو یہ میرے مومن بندے ہیں، ستاروں کے منکر ہیں، جنہوں نے کہا کہ نچھتر کے سبب سے ہوئی تو وہ میرے

(۱)صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کفر من قال مطرنا بالنوء: ۲۳۱

منکر ہیں، اور ستاروں کے معتقد ہیں)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے زمانہ جاہلیت کے ایک عقیدہ کی نفی فرمائی ہے، مقام حدیبیہ میں صبح کی نماز کا وقت تھا اور رات کو بارش ہوئی تھی، اس کے بعد یہ قصہ ہوا کہ آپ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا؟ صحابہ نے عرض کیا؛ اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں، یہاں پر آپ ﷺ نے ایک اہم بات بتانے سے پہلے سوال کا انداز اختیار فرمایا ہے، جب کہ بات پہنچانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ سیدھے سیدھے بات کو بتا دیتے، لیکن ایک مؤثر طریقہ یہ بھی ہے کہ پہلے سوال کر کے ذہن میں تجسس وطلب پیدا کی جائے، اور اس کے قبول کرنے کی بہتر سے بہتر طریقہ پر صلاحیت پیدا کی جائے اور اس کے بعد بات بتائی جائے، آپ ﷺ کا یہی طریقہ تھا، مذکوہ حدیث میں بھی آپ ﷺ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، اور صحابہ کے پوری طرح متوجہ ہونے کے بعد فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے؛ میرے کچھ بندے مجھ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور کچھ کافر ہیں، لہٰذا جو بندے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے بارش ہوئی ہے تو وہ مجھے ماننے والے ہیں اور ستاروں و کواکب پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، گویا ان کا انکار کرتے ہیں، اور جو بندے یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں پچھتر کی وجہ سے اور فلاں ستارے کے فلاں مدار میں پہنچنے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے، گویا وہ ستاروں کو مانتے ہیں اور ہمیں نہیں مانتے۔

طریقہ تبلیغ

آپ ﷺ کے بات پہنچانے کا جو طریقہ رہا ہے، اس میں آپ ﷺ نے بڑی حکمتیں اختیار فرمائی ہیں، بات پہنچانے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی مناسبت سے اور کسی موقع پر آپ یہ کہہ دیتے کہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے، لیکن بجائے اس کے آپ ﷺ نے ایک مرتبہ مقام حدیبیہ میں جب کہ بارش ہوئی اور اس کے بعد بارش کھل گئی، اس وقت آپ ﷺ نے سب کو مخاطب کر کے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ایسے بہت سے

لوگ ہیں جو ستاروں پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں پچھتر کی وجہ سے ہمیں بارش ملی، اور جب فلاں ستارے فلاں جگہ پر پہنچے تب بارش ہوئی، گویا وہ لوگ بجائے اللہ کے ستاروں کی طرف بارش کی نسبت کرتے تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کا میرے اوپر ایمان ہے اور بہت سے ایسے بندے ہیں جن کا میرے اوپر ایمان نہیں ہے، آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے ارشاد فرمائی کہ جو لوگ ستاروں پر یقین رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ستاروں سے کام ہوگا وہ گویا اللہ کے منکر ہیں اور اللہ کی قدرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں، اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بارش اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اسی کے حکم سے بارش ہوتی ہے، اور ستاروں کو کوئی دخل نہیں ہے تو وہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور گویا ستاروں کا انکار کرتے ہیں۔

عربوں کا رواج

عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ پچھتر کی بنیاد پر اپنے فیصلے کرتے تھے، اور ان کو دیکھ کر ہی وہ یہ طے کرتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے، اگر ان کو کوئی کام کرنا ہوتا تھا تو وہ پہلے ان ستاروں کا مشاہدہ کرتے تھے تا کہ وہ یہ طے کر سکیں کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں وہ کام ہمارے لیے مناسب ہے یا نہیں، گویا ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ ستارے ایک طرح کا تصرف رکھتے ہیں، اور جب یہ ستارے فلاں جگہ پہنچیں گے تو گویا انہیں کے ذریعہ سے یہ کام ہوگا، اور اگر اس کے مخالف راستہ پر آئیں گے تو یہ کام نہیں ہوگا، یہ ایک خاص قسم کا ان کا تصور تھا، زمانہ جاہلیت میں ایسے بے شمار جاہلی تصورات تھے، جن کو اللہ کے رسول ﷺ نے ختم فرمایا، اسی طرح یہ بھی ایک جاہلی تصور تھا جس کے بارے میں آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ بھی ایک مشرکانہ عقیدہ ہے۔

نجومیوں کی بڑ

زمانہ جاہلیت میں اس عقیدہ کے فروغ کا ایک بڑا سبب نجومیوں کی کثرت تھی، اسی لیے اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب خرافات اس زمانہ کے نجومیوں کی بڑ تھی، وہ

لوگ ستارں کی بعض علامات دیکھ کر پیشین گوئیاں کرتے تھے، زمانہ جاہلیت میں اس کا بہت رواج تھا، بہت سے لوگ ان کے پاس جاتے تھے اور جا کر پوچھتے تھے کہ ہمارے گھر فلاں مہینہ اور فلاں تاریخ میں شادی مناسب ہے یا نہیں؟ یا ہم فلاں کام کرنے جارہے ہیں وہ ہمارے لیے مناسب ہے یا نہیں؟ پھر وہ اس شخص کی کنڈلی دیکھتے تھے اور الٹی سیدھی پیشین گوئیاں کرتے تھے، جیسا کہ ہمارے ملک میں برادران وطن کے یہاں نظام رائج ہے، جو کہ وہی پرانا جاہلی رواج ہے، آج بھی ہندوؤں میں یہ بات عام ہے کہ وہ اپنی شادیاں کرنے سے پہلے اپنے پنڈتوں سے پوچھتے ہیں کہ شادی کے لیے کون سی تاریخ مناسب ہے؟ چنانچہ ان کے پنڈت ان کی کنڈلی دیکھ کر اور دنیا بھر کا حساب لگا کر ان کو بتاتے ہیں کہ تمہارے لیے شادی کی فلاں تاریخ مناسب ہے اور فلاں مناسب نہیں ہے، ظاہر ہے یہ سب لغویات ہیں، اور اللہ معاف کرے! بسا اوقات مسلمانوں کے اندر بھی یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ بھی انہیں بنیادوں پر کام کرتے ہیں اور اللہ کی ذات پر یقین نہیں رکھتے ہیں، جب کہ یہ ایک مشرکانہ عقیدہ ہے، اس لیے ہر صاحب ایمان کا یقین اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے، توحید اسی کا نام ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے آدمی یقین رکھے کہ یہ سب اللہ کے کرنے سے ہو رہا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی سبب کو دیکھ کر متاثر نہ ہو کہ اس سبب کی وجہ سے کام ہو رہا ہے، بلکہ یہ ذہن میں رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اسباب پیدا فرمائے ہیں، اور اسباب کا حال یہ ہے کہ ایک سبب ابھی ہم کو نظر آ رہا ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سبب کی بنیاد پر فلاں مسبب ہمارے سامنے آ جائے گا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ سبب ہی غائب ہو جاتا ہے، معلوم ہوا اسباب کی کوئی حقیقت نہیں ہیں، اسباب بدلتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہی نظام ہے۔

بے عقلی کی انتہاء

آج کے اس علمی ترقی یافتہ دور میں بھی کتنے لوگ ایسے ہیں جو ہاتھ کی لکیریں

دکھاتے ہیں اور اپنا مستقبل معلوم کرتے ہیں کہ ہم کو دولت ملے گی یا نہیں ملے گی؟ مستقبل میں ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟ اور یہ نہیں جانتے کہ ہاتھ کی لکیریں روز بدلتی ہیں، آج ہاتھ کی لکیریں کچھ ہیں اور کل کچھ ہو جائیں گی، واقعہ یہ ہے کہ جو آدمی ان چیزوں کے چکر میں پڑتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ چیزیں بالکل ریت کی لکیریں ہیں، جیسے ریت کے اوپر جو لکیریں بنائی جاتی ہیں، وہ دن میں ہوتی ہیں اور شام کو ختم ہو جاتی ہیں اور وہاں پر ایک نیا ڈیزائن بن جاتا ہے، ایسے ہی ہاتھ اور پیشانی کی لکیروں کا حال ہے کہ ان میں انسان کو ہر روز نیا ڈیزائن نظر آئے گا، عقل مندی تو یہ ہے کہ اس بات پر یقین رہے کہ اللہ نے ہمارا مستقبل طے کیا ہے، اور اس کو اللہ ہی جانتا ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

پریشانیوں کا سبب

یہ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ان موہوم باتوں میں پڑتے ہیں ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، وہ مصیبت میں پڑ جاتے ہیں، اور صرف ایک ایک چیز میں غور ہی کرتے رہتے ہیں کہ یہ الٹا ہو رہا ہے یا سیدھا ہو رہا ہے، اس لیے اللہ کی ذات پر یقین ہونا چاہیے، اور یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی یہ ساری چیزیں رکھی ہیں اور اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون سی چیز مؤثر ہے اور کون سی چیز مؤثر نہیں ہے، یاد رہے اگر کوئی ان چیزوں کے پیچھے پڑتا ہے اور ان کو مؤثر سمجھتا ہے تو گویا وہ اللہ کی ذات کا ایک طرح سے انکار کر رہا ہے اور ان چیزوں پر یہ سمجھ کر ایمان لا رہا ہے کہ ان سے ہمارا کام بن رہا ہے، ظاہر ہے یہ ایک طرح کا شرک ہے، اس لیے ان تمام باتوں سے دور رہنے کی ضرورت ہے اور اللہ کی ذات پر یقین رکھنے کی ضرورت ہے۔

علم نجوم

علم نجوم ایک مستقل فن ہے، اور وہ فن یہ ہے کہ اس کے ماہر لوگ ستاروں کو دیکھ کر

سمتیں متعین کرتے ہیں اور راستے طے کرتے ہیں، قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ (النحل: ١٦)

(اور ستاروں سے لوگ راستے پاتے ہیں)

ستاروں سے راستہ پانے کا مطلب یہ نہیں کہ ستاروں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کب بارش ہوگی اور کب نہیں ہوگی، کب فلاں کام ہوگا اور کب فلاں کام نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب ہے ستاروں کو دیکھ کر لوگ راستے طے کرتے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ان ستاروں کو ایسا رکھا ہے کہ ان سے سمتیں متعین ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر آدمی صحرا اور سمندر میں سفر کرتا ہے، گرچہ اس زمانہ میں بہت سہولیات ہیں، لیکن قدیم زمانہ میں جب کچھ نہیں تھا، اس وقت صحرا اور سمندر کے سفر میں راستوں کے متعین کرنے کا یہی تنہا ذریعہ تھا کہ لوگ ستاروں کو دیکھتے تھے اور ستاروں کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتے تھے کہ ہم کس رخ کی طرف جارہے ہیں اور ہم کس ملک کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہم کو کس طرف چلنا چاہیے، درحقیقت یہی وہ علم ہے جس کو ''علم نجوم'' کہتے ہیں، یہ علم مطلوب ہے اور مفید بھی ہے، لیکن نجومیوں کی جو پیشین گوئیاں ہوتی ہیں وہ سب مشرکانہ باتیں ہیں، اور دین وایمان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ان سے بہت دور رہنے کی ضرورت ہے، البتہ اگر کوئی آدمی ستاروں کو دیکھ کر سمتیں متعین کرتا ہے یا اوقات کی تعیین کرتا ہے تو بالکل درست ہے۔

سعد ونحس کی بنیاد

انسانی نظام زندگی میں کئی مواقع پر ستاروں سے مدد ملتی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے، جیسے سورج اور چاند ہے، ان کو دیکھ کر مہینے طے ہوتے ہیں، ایام طے ہوتے ہیں، ہفتے طے ہوتے ہیں، اسی طرح ستاروں کو دیکھ کر اوقات طے ہوتے ہیں، سمتیں طے ہوتی ہیں اور رخ طے ہوتے ہیں، گویا یہ ایک مستقل علم ہے، اور اس سلسلہ میں سائنس نے بھی بڑی ترقیاں کی ہیں، ان لوگوں نے نہ جانے کہاں کہاں اور کن

کن ستاروں کی کھوج کی ہے، اوراس سے ان کوفوائد بھی حاصل ہوئے ہیں، معلوم ہوا یہ بالکل ایک الگ علم ہے، جس کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن ان ستاروں کو مؤثر سمجھنا، اوران کو گویا سبب قرار دینا اور یہ سمجھنا کہ فلاں ستارہ فلاں جگہ پہنچے گا تو یہ کام ہوگا، یا فلاں جگہ جنگ چھڑ جائے گی اور فلاں ملک کی قسمت کا ستارہ گردش میں ہے، لہٰذا وہاں کے حالات خراب ہو جائیں گے، جیسا کہ آج کل عام بول چال میں بھی یہ جملہ بہت بولا جاتا ہے، جب کسی کی حالت درست نہ ہوتو اس کو کہا جاتا ہے کہ ''تمہاری قسمت کا ستارہ گردش میں ہے'' ظاہر ہے یہ سب لغو باتیں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ سب ستارے اللہ کے ہیں، اس کے بنائے ہوئے اور پیدا کیے ہوئے ہیں، وہ جہاں چاہتا ہے ان کو پہنچاتا ہے، ان کے متعین راستے ہیں، ان سے آدمی راستے پاسکتا ہے اور دنیا میں ان کے ذریعہ اپنا سفر آسان کرسکتا ہے، لیکن ان کو متصرف سمجھنا اوران کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ ان سے سعد ونحس کا خاص تعلق ہے، اور جب فلاں ستارہ فلاں منزل میں پہنچتا ہے یا فلاں برج میں پہنچتا ہے تو وہ بڑی مبارک ساعت ہوتی ہے، اگراس وقت شادی کی جائے تو وہ شادی بڑی مبارک ہوگی، اور جب فلاں ستارہ فلاں جگہ پہنچے گا تو وہ بڑی منحوس ساعت ہوتی ہے، اگراس وقت شادی کی جائے گی تو وہ شادی منحوس رہے گی، یہ سب لغویات ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی وقت منحوس ہے اور نہ کوئی وقت مسعود ہے، سارے اوقات اللہ کے ہیں، اور سعد ونحس کا تعلق اعمال سے ہے، لہٰذا جو انسان اچھے اعمال کر رہا ہے وہ اپنے لیے سعادت کا انتظام کر رہا ہے اور جو بداعمالیاں کر رہا ہے وہ اپنے لیے شقاوت یعنی نحس کا انتظام کر رہا ہے، نحس بد اعمالیوں سے ہوتی ہے، حاصل بحث یہ کہ ستاروں وغیرہ کو متصرف سمجھنا شرک کا ایک عمل ہے جس سے بہت دور رہنا چاہیے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی زمانہ اسلام میں آپ ﷺ نے صراحت سے نفی فرمادی۔

تین جاہلی تصورات

”عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ؛ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّي حَدِيْثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ وَقَدْ جَاءَ اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ، وَإِنَّ مِنَّا رِجَالًا يَأْتُوْنَ الْكُهَّانَ، قَالَ: فَلَا تَأْتِهِمْ، قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُوْنَ، قَالَ: ذٰلِكَ شَيْءٌ يَجِدُوْنَهُ فِيْ صُدُوْرِهِمْ فَلَا يَصُدَّنَّهُمْ، قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ، قَالَ: كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ يَخُطُّ، فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَاكَ.“(۱)

(حضرت معاویہ بن الحکم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا؛ یارسول اللہ! مجھے اسلام لائے ہوئے تھوڑا عرصہ گذرا ہے، اب اللہ کے فضل وکرم سے اسلام کا دور ہے، لیکن ابھی ہم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کاہنوں کے پاس جاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم کاہنوں کے پاس نہ جانا، میں نے عرض کیا: ہم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو شگون لیتے ہیں، آپ نے فرمایا: یہ ایک چیز ہے، جس کو لوگ اپنے دل میں پاتے ہیں، پس ان کو چاہیے کہ یہ چیز ان کو کام سے نہ روکے، میں نے عرض کیا: ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو خط کھینچتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا ایک نبی خط کھینچتے تھے تو اگر لوگوں کا خط ان کے خط کے موافق ہے تو ٹھیک ہے)

---

(۱)صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب تحریم الکلام فی الصلاۃ: ۱۱۹۹

اس حدیث میں آپ ﷺ نے تین باتیں ارشاد فرمائیں: (۱) کاہنوں کے پاس مت جاؤ (۲) پرندوں سے شگون مت لو (۳) زائچے مت بناؤ۔

پہلا تصور

حضرت معاویہ بن حکمؓ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں ابھی تازہ تازہ اسلام لایا ہوں، ابھی مجھ سے زمانہ جاہلیت کچھ دور نہیں ہے، لہٰذا اس زمانہ کے بعض ایسے اعمال ہیں جن کے بارے میں مجھے اسلام کا نقطہ نظر نہیں معلوم ہے، اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ ہم میں بہت سے لوگ کاہنوں کے پاس جاتے تھے، کیا زمانہ اسلام میں یہ درست ہے؟ آپ ﷺ نے صاف فرمادیا کہ ان کے پاس مت جاؤ۔

ممانعت کی وجہ

اس صریح ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں اور اپنی قسمت کا حال معلوم کرتے ہیں، اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ ہمارے لیے فلاں کام مفید ہے یا مضر؟ گویا ان سے مشورے لیتے ہیں اور ان کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ غیب جانتے ہیں، جب کہ ان کاہنوں کا حال یہ ہے کہ ان کا شیاطین سے تعلق ہوتا ہے، اور شیاطین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آسمانوں کے اردگرد چکر مارتے رہتے ہیں اور کان لگائے رہتے ہیں، تاکہ وہاں سے کچھ سن گن مل جائے، اور پھر دنیا میں جو ان کے اپنے چیلے چاپڑ ہیں ان کو آکر بتادیں اور دنیا میں ان کی چودھراہٹ قائم رکھیں، اسی چکر میں شیاطین آسمان پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں، اور اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کے کانوں میں کچھ پڑ جائے، اسی لیے وہاں شہاب ثاقب سے ان کی پٹائی ہوتی ہے اور وہ بری طرح وہاں سے بھاگتے ہیں، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ان کے کان میں کوئی جملہ پڑ جاتا ہے اور وہ اس کو اپنے دوستوں سے آکر بیان کرتے ہیں، پھر وہ سب مل کر اس ادھورے جملہ پر

اپنی قیاس آرائی کرتے ہیں، اور اس میں نمک مرچ لگاتے ہیں اور اس کے بعد اپنے پاس آنے والوں کو اس کی روشنی میں الٹی سیدھی باتیں بتاتے ہیں، ظاہر ہے شیاطین کو آسمان سے جو آدھا پونا جملہ ملتا ہے اس سے بات واضح نہیں ہوسکتی، اسی لیے وہ ایسے جملے اختیار کرتے ہیں کہ چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی، یعنی ایسا جملہ بولتے ہیں کہ اگر کوئی کہے آپ نے تو یہ کہا تھا تو وہ جواب میں کہیں گے: ہاں ہم نے یہی تو کہا تھا اور اگر اس کے خلاف کوئی دوسری بات ہو جائے اور آدمی آکر کہے کہ آپ نے تو یہ کہا تھا تو وہ کہیں گے کہ ہاں ہم تو یہی کہہ رہے تھے، غرض کہ وہ بالکل مبہم اور غیر متعین بات کہتے ہیں، اور جب بات مبہم ہوگی تو آدمی جو چاہے اس کو معانی پہنا دے، بس اسی طرح وہ اپنی دوکان چمکاتے ہیں، کاہنوں کا یہ دستور پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے، بہت سی جگہوں پر ایسے لوگ بیٹھے رہتے ہیں اور لوگ ان سے جا کر اپنی قسمت کا حال معلوم کرتے ہیں، اور قسمت کا حال معلوم کرکے ان کے ہاتھوں اپنی قسمت کھوتے ہیں، اسی لیے آپ ﷺ نے ایسی نامناسب چیزوں سے تعلق رکھنے کو صاف صاف منع کر دیا۔

دوسرا تصور

صحابی مذکور نے دوسری بات یہ کہی کہ پرندوں سے شگون لینے کا ایک پرانا دستور چلا آرہا ہے، اور لوگوں کے دل ودماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر پرندہ آدمی کے ہاتھ سے اڑ کر دائیں طرف جائے گا تو کام بن جائے گا اور اگر بائیں طرف جائے گا تو کام نہیں بنے گا، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز ہرگز لوگوں کو یہ عمل کام سے نہ روکے، مثلاً: کسی کے آگے سے بلی راستہ کاٹ گئی تو وہ صاحب راستہ پلٹ گئے اور کام کو نہیں گئے، مذکورہ حدیث میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق آپ ﷺ نے صاف کہہ دیا کہ ہرگز ہرگز یہ چیز ان کو کام سے نہ روکے، کیونکہ اس عمل سے کسی کے کام نہیں رکتے، آدمی جو کام کر رہا ہے اس کو وہ کرنا چاہیے، کام اللہ کے کرانے سے ہوتے ہیں، اس کے فضل وحکم سے ہوتے ہیں، اور بلی راستہ کاٹ گئی یا پرندہ بائیں طرف چلا گیا اور

الو بول گیا ان چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا ہے، گویا اس حدیث میں آپ ﷺ نے صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ تم اپنے گھر سے جو عزم لے کر نکلو اس کو مکمل کرو، اپنا کام کرو، بات آگے بڑھاؤ، اور کسی موہوم نظریہ کو لے کر نہ بیٹھ جاؤ، یہ وہمیوں اور خرافاتیوں کے طریقے ہیں جو ان چیزوں پر دھیان دیتے ہیں۔

عقلی سطح

موجودہ دور میں بھی ایسے بہت سے عقل کے مارے نظر آتے ہیں جو انہیں چکروں میں پڑے رہتے ہیں، ایک زمانہ میں لکھنؤ ڈالی گنج پل پر ایک شخص طوطے کو پنجرے میں لیے بیٹھا رہتا تھا، اور اس کے پنجرے میں بہت سارے کاغذات ہوتے تھے، جن میں لوگوں کی قسمتیں لکھی ہوتی تھیں، اور لوگ اس کے پاس آکر اپنی اپنی قسمت کا حال معلوم کرتے تھے، لہٰذا جب بھی کوئی شخص آتا اور اپنی قسمت معلوم کرتا تو وہ اس طوطے کو چھوڑ دیتا پھر وہ طوطا اپنی چونچ میں ان کاغذات میں سے جو کاغذ اٹھا کر لا دیتا، وہ شخص اس کاغذ کو کھول کر آنے والے شخص کی قسمت بتاتا تھا، ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہوگی کہ آدمی کی قسمت طوطے کی چونچ میں ہوجائے، اور وہ جا کر جو کاغذ اٹھا لائے وہ آدمی کی قسمت ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ آدمی کے دماغ کی خرابی کی بات ہے، جب وہ گرتا ہے تو جانوروں سے بھی زیادہ گر جاتا ہے، قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ (الأعراف: ۱۷۹)

(وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں)

یعنی ایسے لوگ جانوروں سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں، جانوروں میں بھی کسی حد تک عقل ہوتی ہے، لیکن جب انسان کی عقل ماری جاتی ہے تو وہ جانور سے آگے چلا جاتا ہے، معلوم ہوا پرندوں سے شگون لینے کا رواج آج بھی ہے اور پہلے بھی تھا، لوگ پرندوں سے شگون لیتے تھے کہ اگر اس طرف اڑا تو یہ ہوگا اور اس طرف اڑا تو یہ ہوگا، ان

سب خیالات کے متعلق اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ ایسی تمام چیزیں لغویات ہیں، اور ان کے چکر میں پڑنا عقیدہ کو خراب کرنا ہے۔

خدا تعالیٰ کے فیصلے

اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے، اس کا ہر معاملہ عجیب وغریب ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسی عقلیں ہوتی ہیں، اسی کے اعتبار سے فیصلے بھی فرمادیتا ہے، قرآن مجید میں بھی اس راز کی طرف اشارہ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ﴾ (النساء: ۱۱۵)

(وہ جدھر بھی رخ کرے گا اسی رخ پر ہم اس کو ڈال دیں گے اور اس کو جہنم رسید کریں گے)

معلوم ہوا جو راہ راست سے پیچھے ہٹتا ہے، اس کو ہم ایک دھکا اور مارتے ہیں، گویا یہ اللہ کا ایک نظام ہے کہ جو آگے بڑھتا ہے اس کو اور آگے کیا جاتا ہے اور جو پیچھے جاتا ہے اس کو مزید پیچھے کیا جاتا ہے، اسی لیے ایسا بہت دیکھا گیا ہے کہ آدمی جو عقیدہ رکھتا ہے اسی عقیدہ کے مطابق ہو بھی جاتا ہے۔

ہمارے یہاں ایک مشہور قصہ ہے، جس کو ہمارے پھوپھا مولوی محمود حسنی کے دادا سناتے تھے کہ ان کے ایک مسلمان دوست اور وہ خود ایک جگہ افسر تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کی بات ہے ہم دونوں آفس ایک ساتھ جارہے تھے کہ اچانک بلی راستہ کاٹ گئی، بس وہ کہنے لگے بلی راستہ کاٹ گئی لہٰذا آگے جانا مناسب نہیں ہے، انہوں نے ان کو بہت سمجھایا کہ یہ بالکل لغو بات ہے، بلی کے راستہ کاٹنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے، ہم کو کئی مرتبہ واسطہ پڑ چکا ہے، مگر وہ ان کے سمجھانے سے کسی صورت نہ مانے، اور یہی کہتے رہے کہ جب بلی راستہ کاٹ جائے تو بہت منحوس ساعت ہوتی ہے، اس لیے اب میرا آگے جانا مناسب نہیں ہے، البتہ جب انہوں نے ان کو بہت سمجھایا، تو وہ بات مان گئے اور آفس چلے گئے، مگر چونکہ دل اندر دھک دھک ہورہا تھا، اس لیے قسمت

کے مارے جب آگے چلے گرے تو ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا، بس وہ فوراً کہنے لگے کہ دیکھئے حسنی صاحب! ہم نے کہا تھا: بلی راستہ کاٹ گئی ہے، لہٰذا ہمارا جانا مناسب نہیں ہے، اس پر انہوں نے کہا؛ راستہ تو ہمارا بھی کاٹا ہے، ہم بھی تو ساتھ میں تھے، لیکن ہمارا ہاتھ کیوں نہیں ٹوٹا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے دماغ میں پہلے سے فتور بیٹھا تھا، گویا پہلے ہی آپ کا ہاتھ دماغ میں ٹوٹ چکا تھا، وہی عمل میں بھی ٹوٹ گیا۔

معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کا معاملہ بہت عجیب ہے کہ آدمی جیسا عقیدہ رکھتا ہے ویسا ہی ہو بھی جاتا ہے، اور پھر آدمی اسی غلط بات پر پختہ یقین کر لیتا ہے، ظاہر ہے یہ سب لغو باتیں ہیں، ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ ایک طرح کے مشرکانہ عقیدے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی ذات پر بھروسہ ہونا چاہیے، حالات کیسے بھی ہوں اگر اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے تو سب کام آسان ہو جاتے ہیں، اور اگر اللہ کی ذات پر بھروسہ نہیں ہے تو کہاں کہاں انسان ٹھوکر کھائے گا اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

تیسرا تصور

مذکورہ حدیث میں تیسرا سوال یہ ہے کہ کچھ لوگ کاغذ پر زائچے بناتے ہیں اور زائچے بنانے کے بعد ایک خاص حساب لگاتے ہیں، اور اس حساب کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں، اس عمل کے متعلق کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک نبی تھے جن کا یہ خاص فن تھا، وہ زائچے بناتے تھے، اور خاص انداز سے لکیریں کھینچ کر اس سے حساب لگاتے تھے، اور پھر لوگوں کو خاص طریقہ سے ان کے مسائل بتاتے تھے، اب اگر وہ طریقہ کوئی جانتا ہو تو وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن جب آپ ﷺ نے فرمادیا کہ یہ طریقہ کوئی جانتا ہو تو کرے، اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ کوئی شخص بھی وہ طریقہ نہیں جانتا ہے اور جب نہیں جانتا ہے تو اس کے لیے ایسا کرنا بھی درست نہیں ہے، اس لیے آج جو لوگ زائچے بناتے ہیں، لکیریں کھینچتے ہیں اور ان سے قسمت کا حال معلوم کرتے ہیں، یہ بالکل درست نہیں ہے، اور یہ عمل ناجائز و حرام ہے، اس لیے کہ یہ طریقہ نبیوں والا

طریقہ نہیں ہے، حدیث شریف میں جن نبی کا آپ ﷺ نے تذکرہ کیا ہے، ان کا طریقہ کیا تھا؟ وہ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے، لہٰذا جب وہ طریقہ نہیں رہا تو ظاہر ہے کہ اب کسی کے لیے اس طریقہ کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اب جو بھی وہ طریقہ اختیار کرے گا وہ اپنے ذہن سے کرے گا اور جب اپنے ذہن سے کرے گا تو کہاں ٹھوکر کھائے گا کچھ نہیں پتہ، لہٰذا جب نبی کا طریقہ نہیں معلوم ہے، اس لیے کسی کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ لکیریں کھینچ کر کسی کی قسمت کا حال معلوم کرے۔

نحوست کا تصور

"عَنْ أَبِىْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ؛ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ."(۱)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چھوت چھات کوئی چیز نہیں، نہ پرندوں سے شگون لینا درست ہے، نہ ہامہ کا کوئی وجود ہے اور نہ صفر کے مہینہ میں کوئی نحوست ہے)

چھوت چھات کی نفی

مذکورہ خیالات زمانہ جاہلیت کے عقائد تھے جن کی آپ ﷺ نے نفی فرمائی اور معاشرہ سے ان خراب عقائد کا صفایا کیا، لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج بھی اس طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں، مذکورہ حدیث میں پہلی چیز جس کی آپ ﷺ نے نفی فرمائی وہ چھوت چھات ہے، اس وقت یہ ایک عام تصور تھا کہ اگر کہیں ایسی جگہ جائیں گے جہاں کوئی بیماری ہے یا اسی قسم کی کوئی دوسری چیز ہے تو وہ چیز ہمیں بھی لاحق ہوجائے گی، آپ ﷺ نے ان تمام چیزوں سے منع فرمایا اور ذہن و دماغ میں یہ عقیدہ راسخ کردیا کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے، کسی کے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، اور سارے اسباب اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اگر اسباب میں اللہ تعالیٰ تاثیر ڈالتے ہیں تو اسباب کام کرتے ہیں، اور اگر اللہ تبارک و

---

(۱)صحیح البخاری، کتاب الطب، باب لا ھامۃ: ۵۷۵۷

تعالیٰ ان اسباب کی تاثیر سلب کر لیتے ہیں تو وہی اسباب کام نہیں کرتے، آدمی ایک دوا کھاتا ہے اس کو فائدہ ہو جاتا ہے اور وہی دوا دوسرا آدمی کھاتا ہے اس کو فائدہ نہیں ہوتا، معلوم ہوا دوا کے اندر جو فائدہ ہے وہ اس کے اندر ذاتی طور پر نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اللہ کا حکم ہوا تو فائدہ ہوگا ورنہ فائدہ نہیں ہوسکتا۔

ھوالشافی

ہمارے دادا ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ ایک اچھے حکیم تھے، ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی تھے، اور ہومیوپیتھی کے بھی ماہر تھے، ان کے پاس ایک صاحب دانت کے درد کی دوا لینے آئے، انہوں نے دوا دی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، غرض وہ کئی مرتبہ دوا لے گئے لیکن ذرہ برابر فائدہ نہ ہوا، بالآخر فرمایا: ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب ہومیوپیتھی کے اچھے ڈاکٹر ہیں، تم ان کے پاس جاؤ اور ان سے اپنا علاج کراؤ، چنانچہ وہ صاحب وہاں گئے اور ان سے دوا لی اور ماشاء اللہ ایک ہی خوراک میں بالکل ٹھیک ہو گئے، پھر وہ صاحب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم ان کے پاس گئے اور الحمدللہ ان کی ایک ہی خوراک سے فائدہ ہو گیا، دادا صاحب نے کہا: اگر ان کا لکھا نسخہ موجود ہو تو دکھائیے، چنانچہ جب نسخہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا وہی دوا انہوں نے بھی لکھی تھی جو دوا دادا صاحب مستقل لکھ رہے تھے، لیکن یہ لکھ لکھ کر تھک گئے اور کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور ان کے لکھنے کے بعد اسی خوراک سے ایک ہی مرتبہ میں فائدہ ہو گیا، گویا اللہ تعالیٰ یہ دکھاتا ہے کہ دوا کے اندر فی نفسہٖ شفا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ شفا دیتا ہے، اور جب چاہتا ہے شفا دیتا ہے، جب چاہتا ہے شفا نہیں دیتا ہے، اسی لیے ایسا ہوتا ہے کہ بسا اوقات آدمی وہی دوا کھاتا ہے شفا پاتا ہے اور وہی دوا کھاتا ہے اور اس کا انتقال ہو جاتا ہے، اس سے یہ پتہ چلا کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

متعدی امراض کا حکم

دین اسلام میں چھوت چھات کوئی چیز نہیں ہے، اس لیے یہ بات ہمیشہ پیش نظر

رہنی چاہیے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، معاشرہ میں بہت سے امراض کو متعدی سمجھا جاتا ہے، جیسے جذام کا مرض ہے، اور اس طرح کے بعض دیگر امراض بھی ہیں جن کے متعلق ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ ان میں جراثیم ہوتے ہیں، مثلاً: کتے کے کاٹے کا مرض ہے، اس میں ایسے جراثیم ہوتے ہیں جو دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں، غرض اس طرح کے جو بھی امراض ہیں، ایسے موقعوں پر آدمی کا عقیدہ خراب ہو جاتا ہے، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم چونکہ فلاں مریض کے پاس گئے تھے، اس لیے ہمیں بھی وہ مرض لگ گیا، اور وہ یہ نہیں سمجھتا کہ مرض کسی کے عمل سے نہیں لگتا، بلکہ محض اللہ کے حکم سے لگتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے اس عقیدہ کی نفی فرمائی کہ چھوت چھات کوئی چیز نہیں ہے، سب کچھ اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے، ایک شخص مریض کے پاس جاتا ہے اس کو کچھ نہیں لگتا، اور ایک شخص جاتا ہے اس کو لگ جاتا ہے، لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے کو کیوں نہیں لگا اور بعد والے کو کیوں لگا؟ اگر اس حقیقت پر آدمی غور کرے تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کرنے سے ہوتا ہے۔

آپ ﷺ نے ایسے مواقع پر عقیدہ کی خرابی سے بچنے کے لیے سد باب کے طور پر بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، ایک موقع پر فرمایا:

"فر من المجذوم فرارك من الاسد"(۱)

(جذامی سے ایسے ہی بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو)

اس حدیث اور چھوت چھات کی ممانعت والی حدیث میں بظاہر ایک طرح کا تضاد لگ رہا ہے، اس لیے کہ یہاں کہا جا رہا ہے جذامی سے ایسے ہی بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو اور وہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ چھوت چھات کوئی چیز نہیں ہے، لیکن غور کیا جائے تو یہ سمجھ میں آئے گا کہ یہاں اصلاً عقیدہ کی اصلاح کی جا رہی ہے اور وہاں جو بات کہی گئی ہے وہ بھی درحقیقت عقیدہ کو سالم اور محفوظ رکھنے کے لیے ہے، وہ اس طرح کہ آدمی جذامی کے پاس جائے اور اتفاق کی بات کہ وہ مرض اس کو لگ جائے تو

---

(۱) مسند أحمد: ۹۹۷۳

وہ یہی کہے گا کہ ہم جذامی کے پاس گئے تھے اس لیے مرض لگ گیا، معلوم ہوا ایسی نوبت سے بچانے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جذامی سے دور رہو، کیونکہ جب تم وہاں جاؤ گے اور اگر تم کو مرض لگے گا تو تمہارا عقیدہ خراب ہوگا، اس سے بہتر یہ ہے کہ وہاں مت جاؤ، لیکن اگر کوئی ایسا شخص ہے جس کا عقیدہ پہاڑ کی طرح مضبوط ہے، اس کے لیے کوئی حرج نہیں، اور ایسی متعدد مثالیں ہیں، جو اپنے عقیدہ کی پختگی کی بنیاد پر اس سلسلہ میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے، خود آنحضرت ﷺ کی مثال بھی موجود ہے کہ آپ نے جذامی کے ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، اس کے علاوہ بعد کے دور کی بھی ایسی بے شمار مثالیں ہیں، لیکن یہ اس کے لیے ہے جس کا عقیدہ پہاڑ کی طرح مضبوط ہو، اور اگر جذامی کے پاس بیٹھنے کے بعد اس کو جذام ہو جائے تو وہ یہ نہ کہے کہ جذامی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا اس لیے مجھے جذام لگ گیا، بلکہ یہ کہے کہ اللہ کا حکم تھا اس لیے لگ گیا، اگر کسی شخص کا ایسا عقیدہ ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جیسا کہ عام طور پر عقائد میں کمزوری ہوتی ہے، ایمان میں بھی کمزوری ہوتی ہے اور اللہ کی ذات پر اس طرح کا یقین نہیں ہوتا جیسا کہ ہونا چاہیے تو ایسے لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ایسی جگہ جانے سے پرہیز کریں، جہاں جا کر عقیدہ میں بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس جگہ کوئی وبا پھیلی ہوئی ہو اس جگہ مت جاؤ، اور اگر تم اسی جگہ پر ہو تو وہاں سے نکل کر باہر مت جاؤ(۱) درحقیقت یہ حکم بھی اسی عقیدہ کو محفوظ رکھنے اور ان خطرات کے سد باب کے لیے ہے، کیونکہ اگر آدمی وہاں جائے گا اور مرض لگ جائے گا تو یہی کہے گا کہ میں یہاں کیا آ گیا، ایک عجیب ہی چکر میں پھنس گیا، اسی لیے وضاحت کر دی گئی کہ اگر عقیدہ کمزور ہے تو ایسی جگہوں پر جانے سے احتیاط کریں، اسی طرح اگر کسی جگہ مرض پھیلا ہوا ہے تو وہاں کے لوگ باہر جانے سے پرہیز کریں، اس لیے کہ اگر کوئی باہر نکلا اور اس کا مرض کسی اور کے لگ گیا تو یہی کہا جائے گا کہ فلاں جذامی آیا تھا، اس کی وجہ سے یہاں پر بھی جذام پھیل گیا، اسی لیے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأنبیاء: ۳۴۷۳

آپ ﷺ نے فرمایا: ایسے موقع پر باہر مت نکلو، ہوتا کہ لوگوں کے عقیدے کے اندر بگاڑ پیدا نہ ہوجائے، معلوم ہوا یہ ساری چیزیں سد باب کے لیے ہیں، حقیقت میں چھوت چھات کوئی چیز نہیں۔

ملاحظہ

بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن میں کیڑے ہوتے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے جرثومے ہوتے ہیں، وہ جرثومے قریب جانے سے چڑھ جاتے ہیں، اس سلسلہ میں واضح رہے کہ ایسے موقع پر چھوت چھات کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ وہ مسئلہ ظاہری اسباب کا ہے، اس لیے کہ ضروری نہیں ہے وہ کیڑے آپ کے اوپر چڑھ ہی جائیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ چڑھتے ہیں اور کبھی نہیں بھی چڑھتے ہیں، البتہ بہتر یہی ہے کہ آدمی دور رہے، تاکہ اس کے عقیدے کے اندر بگاڑ پیدا نہ ہو، لیکن یہ عقیدہ ہمیشہ مضبوط رکھے کہ کوئی چھوت چھات نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ کہیں محض پہنچ جانے سے کچھ ہوجاتا ہے، بلکہ سب کچھ اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی جاتا ہے تو کچھ نہیں ہوتا اور دوسرا آدمی جاتا ہے تو اس کو ہوجاتا ہے، معلوم ہوا جو بھی ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، جس کے بارے میں حکم الٰہی ہوا کہ اس کے جراثیم چڑھیں تو چڑھ جاتے ہیں اور جس کے بارے میں حکم ہے کہ نہ چڑھیں تو نہیں چڑھتے ہیں، گویا فی نفسہٖ یہ کوئی چیز نہیں ہے۔

پرندوں سے شگون لینے کی نفی

حدیث بالا میں دوسرا جاہلی عقیدہ جس کی نفی کی گئی ہے، ”پرندوں سے شگون لینا“ ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں، سطور بالا میں اس کے متعلق تفصیلی بحث کی جاچکی ہے۔

ہامہ کی نفی

تیسرا جاہلی عقیدہ ”ھـــــامة“ کا عقیدہ تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ہامہ کی بھی کوئی

حقیقت نہیں ہے، "ھامۃ" الو کو کہتے ہیں اور کھوپڑی کو بھی کہتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں دو عقیدے رائج تھے، پہلا یہ کہ اگر کہیں الو بول گیا تو وہ سمجھتے تھے اب کوئی مصیبت آنے والی ہے، ہمارے گھر میں کوئی مر جائے گا یا کچھ نقصان ہوگا، آج بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی کے گھر میں الو بول گیا تو نحوست آگئی، اب کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے، حالانکہ یہ بالکل بے سر و پا اور حقیقت نہ رکھنے والی بات ہے، الو روز بولتے ہیں، لیکن اس سے کوئی حادثہ پیش نہیں آتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ کوئی جانور منحوس نہیں، کوئی زمانہ منحوس نہیں، بلکہ ہمارے اعمال اثر ڈالتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں گرفت کرتا ہے، ہم کو سزا ملتی ہے، اس کے برخلاف اچھے اعمال سے فائدے بھی ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے عقائد رکھنا کہ کسی جانور کو منحوس سمجھ کر فیصلے کیے جائیں لغو بات ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

زمانہ جاہلیت کا دوسرا تصور یہ تھا کہ اگر کسی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی روح بھٹکتی رہتی ہے، اس کی کھوپڑی چکر مارتی رہتی ہے اور کہتی ہے کہ میرا انتقام لو، غرض جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا تب تک وہ چکر کاٹتی رہتی ہے، ظاہر ہے یہ بھی زمانہ جاہلیت کا ایک لغو عقیدہ تھا، اس کی بھی آپ ﷺ نے نفی فرمائی ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو مر گیا اس کو اتنی فرصت کہاں کہ انتقام کا بھوت اس پر سوار ہو جائے اور وہ زندہ ہو، اور دنیا والوں کے چکر مارے اور جا جا کر یہ کہے کہ میرا انتقام لو اور میری روح بے چین ہے، لہٰذا جب تک انتقام نہ لیا جائے گا میری روح بے چین رہے گی، یہ سب لغو اور بالکل بے حقیقت باتیں ہیں، ان کا اصل سے کوئی تعلق نہیں، اصل بات یہ ہے کہ جب آدمی مار دیا جاتا ہے یا اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، اس کی روح کہاں ہوتی ہے، وہ اللہ ہی جانتا ہے، اگر وہ اچھا ہوتا ہے تو آرام سے سوتی ہے یا جنت کے باغوں میں آرام کرتی ہے، اور اگر برا ہے تو وہ معذب ہوتی ہے، حدیث میں آتا ہے کہ جو برے لوگ ہیں ان کو عذاب قبر ہوتا ہے، اور یہ عذاب قبر روح پر ہوتا ہے، گویا جسم کے ساتھ

روح کو اٹیچ کر دیا جاتا ہے، اور جسم کے ایک چھوٹے حصہ کے ساتھ روح اٹیچ ہوتے ہی بس اس کو عذاب قبر ہوتا رہتا ہے، معلوم ہوا ایسی صورت میں روح کو اللہ تعالیٰ اتنی فرصت کہاں دیں گے کہ جا کر وہ چیختی چلاتی پھرے میرا انتقام لو، واقعہ یہ ہے کہ یہ سب جاہلیت کے تصورات ہیں جن میں سے بہت سارے تصورات بعد میں بھی قائم رہے اور لوگ اس کا شکار ہوتے رہے۔

صفر کی نفی

چوتھا جاہلی عقیدہ ''صفر کے مہینہ میں نحوست'' کا تھا، آپ ﷺ نے صفر کا ذکر فرمایا اور بتایا کہ اس مہینہ میں کوئی نحوست نہیں ہے، لیکن آج بھی بعض علاقوں میں اس مہینہ کو منحوس سمجھا جاتا ہے، اور بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ صفر کے مہینے میں شادی صحیح نہیں ہے، ظاہر ہے یہ بالکل لغو بات ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ نہ کسی جگہ میں نحوست ہے اور نہ کسی زمانہ میں نحوست ہے، نہ کسی جانور اور پرندے میں نحوست ہے، کہیں کوئی نحوست نہیں ہے، کسی انسان میں کوئی نحوست نہیں ہے، درحقیقت نحوست ہماری بداعمالیوں سے پیدا ہوتی ہے، لیکن اور کسی چیز کے اندر کوئی نحوست نہیں ہے۔

محرم الحرام میں شادی

اسی طرح بہت سے لوگ محرم میں شادی نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مہینہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا ہے، اس لیے اس مہینہ میں نحوست ہے، جب کہ یہ بھی نہایت لغو بات ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا عجیب معاملہ ہے، غور کیا جائے تو محرم کا مہینہ وہ ہے جس میں بہت سارے خیر کے کام ہوئے، لیکن حضور ﷺ کے بعد حضرت حسینؓ کی شہادت کا یہ ایک ایسا کام ہوا جس سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب اس واقعہ سے پورا مہینہ منحوس ہو گیا، ایک مرتبہ کی بات ہے کہ میرے پاس ایک فون آیا اور معلوم کیا کہ محرم میں شادی درست ہے یا نہیں؟ ہم نے کہا: محرم میں شادی بہت اچھی بات ہے، ضرور کرنا

چاہیے، صحابہ اور آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ محرم کے مہینہ میں انہوں نے شادی کی۔

نیک و بد اعمال کا اثر

حاصل بحث یہ کہ مہینوں میں کوئی نحوست نہیں ہے، آدمی جب چاہے شادی کرے، یہ تو ہندوؤں کا طریقہ ہے وہ کنڈلی نکلواتے ہیں کہ کون کون سی تاریخ مناسب ہے، کس میں شادی ہوگی، اور کون سی تاریخوں میں نہیں ہوگی، اسلام میں یہ ساری چیزیں بالکل نہیں ہے، بلکہ اسلام میں ان تمام چیزوں سے سختی سے روکا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ سب کچھ اللہ کے کرنے سے ہی ہوتا ہے، جب اس کا فیصلہ ہوتا ہے اسی کے اعتبار سے کام وجود میں آتا ہے، یہ ساری سعادت و برکت سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اسی طرح ہمیں جو بے برکتیاں نظر آتی ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں، اگرچہ اس کے اسباب ہوتے ہیں، اور وہ اسباب ہماری بداعمالیاں ہیں، بداعمالیوں سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے، اس لیے ہمیں اپنے اعمال کو درست کرنے کی ضرورت ہے، جب اعمال درست ہوں گے تو جگہ بھی بابرکت ہوجائے گی، زمانہ بھی بابرکت ہوجائے گا، غرض ہر چیز بابرکت ہوجائے گی، برتن میں آپ اچھی چیز رکھئے برتن قیمتی بن جائے گا، اور برتن میں آپ غلاظت ڈال دیجئے تو برتن دوکوڑی کا بن جائے گا، اور زمانہ بھی ایک برتن ہی کی طرح ہے، یا جو ہماری جگہیں ہیں یہ برتن ہی کی طرح ہیں، لہٰذا اگر ان میں ذکر کیا جائے گا تو زمانہ اور جگہ بابرکت ہوجائے گی، اور اچھے کام کیے جائیں گے تو یہ ساری چیزیں بابرکت ہوجائیں گی، لیکن جب بداعمالیاں کی جائیں گی تو بے برکتی پیدا ہوگی، معلوم ہوا برکت اور بے برکتی ہمارے اعمال سے وابستہ ہے، نہ کسی زمانہ سے متعلق ہے، نہ کسی جگہ سے متعلق ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ عطا فرمائے۔

توحید کا مطلوبہ تصور

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْماً، فَقَالَ: يَا غُلَامُ! إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ: احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ لَكَ، وَإِنِ اجْتَمَعَتْ عَلىٰ أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ إِلَّا قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ."(١)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے بچہ! میں تمہیں کچھ باتیں سکھاتا ہوں ان کو دھیان سے سنو؛ تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تم کو یاد رکھے گا، تم اللہ کو یاد رکھو تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے، جب تم مانگو تو اللہ سے مانگو، اور جب مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو، اور اس بات کو سمجھ لو کہ ساری امت اگر اس بات پر ایک ہو جائے کہ تمہیں ذرا بھی فائدہ پہنچائے، تو تمہیں اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جتنا تمہارے لیے اللہ نے لکھ دیا ہے، اور اگر ساری امت اس بات پر ایک ہو جائے کہ تمہیں کچھ بھی نقصان پہنچائے، تو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر اتنا ہی

(١)سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة، باب حديث حنظلة: ٢٥١٦

جتنا اللہ نے تمہارے لیے لکھا ہے، قلم اٹھ چکے اور صحیفے خشک ہو چکے)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متعدد باتیں ارشاد فرمائیں، اس میں پہلی بات یہ فرمائی کہ تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہیں یاد رکھے گا، تم اللہ کا دھیان رکھو اللہ تمہارا دھیان رکھے گا:

اللہ کے دھیان سے مراد اللہ کا ذکر ہے، یہ ذکر زبان، دل اور دماغ تینوں سے ہو، اللہ کا ذکر صرف زبان کی حد تک نہ رہ جائے، بلکہ وہ دل تک اترے، اور پھر دماغ میں بھی اس کے اثرات محسوس ہوں، آدمی بار بار اللہ کے بارے میں سوچتا رہے، اس کی جو قدرت اور اس کی جو طاقت ہے، اس کے جو تصرفات ہیں اور اس کی جو صفات ہیں، ان کے بارے میں آدمی سوچے، حدیث میں کہا گیا ہے؛ اللہ کی ذات کے بارے میں مت سوچو، اس کی صفات کے بارے میں سوچو، اس لیے کہ اللہ کی ذات کے بارے میں اگر آدمی سوچے گا تو بہک جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ پھر وہ یہ سوچے گا کہ اللہ کیسا ہے؟ اور ظاہر ہے آدمی اس کو صحیح نہیں سوچ سکتا، اس لیے کہ یہ چیز اس کے دماغ سے اوپر کی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے دماغ کو محدود بنایا ہے، وہ اتنا ہی سوچ سکتا ہے جتنا محسوس کرسکتا ہے، جتنا اس کے حواس میں آتا ہے، وہ اتنا ہی سوچ سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں سوچ سکتا، اللہ تعالیٰ نے یہ نظام بنایا ہے کہ اگر اس سے زیادہ سوچے گا تو اس کا دماغ کام کرنا بند کردے گا اور پھر وہ بہک جائے گا، جیسے غبارہ ہوتا ہے، اس میں آپ ایک حد تک ہوا بھر سکتے ہیں، اس کے بعد وہ پھٹ جائے گا، اسی طرح ٹائر ہے جس میں ایک حد تک ہوا بھر سکتے ہیں، اس کے بعد وہ بھسٹ ہو جائے گا، گویا ہر ایک کے حدود ہیں، ان میں وہ رہیں گے تو کام چلے گا، حدود سے آگے جائیں گے تو پھر معاملہ ختم ہو جائے گا، اسی طرح اللہ کی ذات ایسی ہے کہ اس کے بارے میں آدمی سوچ ہی نہیں سکتا، اللہ نے قرآن مجید میں صاف کہہ دیا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: ۱۱)

(اس جیسا کوئی نہیں اور وہ خوب سنتا خوب دیکھتا ہے)

اس کے بعد بھی اگر کوئی انسان سوچے گا تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی محدود عقل سے سوچے گا، اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی عقل بھسٹ ہو جائے گی، اور وہ بہک جائے گا، غلط راستہ پر پڑ جائے گا، لہٰذا اللہ کی ذات کے بارے میں نہیں سوچنا ہے، بلکہ اس کی صفات کے بارے میں سوچنا ہے، اس کی قدرت کے بارے میں سوچنا ہے، اس کی جو مخلوقات ہیں ان کے بارے میں سوچنا ہے، تا کہ اللہ کی قدرت اور اس کے تصرفات کے جو نمونے دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں وہ سامنے آئیں اور اللہ کی ذات پر یقین بڑھے، اور اللہ کا دھیان ہر طرح سے ہو، آدمی دماغ سے اس کی قدرت کے بارے میں سوچے، اس کے تصرفات کے بارے میں سوچے، اس کے علم کے بارے میں سوچے، دنیا میں اس کی جو نشانیاں بکھری ہوئی ہیں ان پر غور کرے جن کا تذکرہ قرآن مجید میں کئی جگہ ہے، اور دل سے اُس کا دھیان رکھے، ہمیشہ دماغ سے سوچے اور دل میں ہمیشہ اس کا دھیان رکھے اور زبان سے ذکر کرتا رہے، حدیث میں آتا ہے کہ انسان کی زبان ذکر سے تر رہے، جب اللہ کے دھیان کی یہ ساری شکلیں ہوں گی تو پھر اللہ اپنے بندہ کی حفاظت کرے گا۔

استحضار کے مراحل

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ بات فرمائی کہ "تم اللہ کا دھیان رکھو اللہ تمہارا دھیان رکھے گا، تم اللہ کو یاد کرو اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے۔"

یہ کیفیت ایک لمحہ میں پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے مشق کرنی ہوتی ہے، جب آدمی بار بار کسی چیز کو سوچے گا، کسی چیز کے متعلق دھیان کرے گا تو دھیان کرتے کرتے یہ صورت پیدا ہوگی، گویا اس چیز کو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، اور اسی چیز کی طرف حدیث پاک میں بھی اشارہ ہے:

"أن تعبد الله كأنك تراه"

(کہ تم اللہ کی ایسی عبادت کرو جیسے اس کو دیکھ رہے ہو)

یہ چیز پہلا زینہ ہے، مقام و مرتبہ کے لحاظ سے پہلی بات یہی ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، لیکن اس کا جو وسیلہ ہے اور اس کا جو زینہ ہے وہ یہ ہے:

"فان لم تكن تراه فانه يراك"(۱)

(تو اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو بے شک وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)

جب اس کی مشق کی جائے گی کہ ہمارے ہر کام کو اللہ کو دیکھ رہا ہے، ہمارے ہر کام سے اللہ واقف ہے، ہر کام اس کے علم میں ہے، بلکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے، جب یہ کیفیت پیدا کی جائے گی، اور اس کا استحضار پیدا کیا جائے گا، اور چلتے پھرتے بار بار یہ بات ذہن میں لائی جائے گی، آدمی کوئی بھی کام کر رہا ہے، کہیں بھی جا رہا ہے، اگر اس کو اس کیفیت کی مشق ہو جائے، اور وہ اس کو بار بار سوچے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو دیکھ رہا ہے، ظاہر ہے جب کسی انسان میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو آدمی ہر کام صحیح طریقہ پر کرے گا، لیکن یہ چیز ایک تو مستقل مشق سے پیدا ہوتی ہے، جس کے بعد انسان اللہ کو اپنے سامنے محسوس کرنے لگتا ہے، البتہ پہلے مرحلہ میں وہ خود یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، لیکن پھر جب یہ مشق بڑھتی ہے تو پھر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، اور اللہ اس کے سامنے موجود ہے، پھر اس کو ایک عجیب کیفیت حاصل ہوتی ہے، اور ظاہر ہے جب یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے تو آدمی احسان کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے، اس لیے کہ انسان کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایک نگراں دیکھ رہا ہے، ذمہ دار دیکھ رہا ہے تو وہ کام صحیح کرتا ہے اور جب وہ سمجھتا ہے کہ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو ڈنڈی مارتا ہے، آپ نے مزدوروں کو دیکھا ہوگا جو کام کرتے ہیں، جب ان کے سامنے ٹھیکیدار ہوتا ہے تو ان کے ہاتھ بہت تیز چلتے ہیں، اور جہاں ٹھیکیدار کہیں گیا بس ان کی ماچس بیڑی نکل جاتی

---

(۱)صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب سؤال جبريل النبي عن الايمان: ٥٠

ہے، اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ٹھیکیدار دیکھ رہا ہے، اگر ہم نے گڑ بڑ کی تو ہمارے پیسے کٹ جائیں گے اور نقصان ہوگا، اور اگر مستعدی کے ساتھ کام کیا تو ہوسکتا ہے ہمیں زیادہ مل جائے، انسان کا مزاج ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی کے سامنے ہے، جو اس کا ذمہ دار ہے وہ اس کے سامنے ہے تو وہ صحیح کام کرتا ہے، اور جب انسان اس کیفیت کو محسوس نہیں کرتا، اس کو دھیان نہیں ہوتا تو وہ گڑ بڑ کرتا ہے، اسی طرح جب اللہ کا دھیان پیدا ہو جاتا ہے، جو کہ خالق و مالک ہے، جس کے بارے میں ایمان والے کا یقین ہے کہ ہم جو کر رہے ہیں اس کا حساب ہم کو اللہ کے سامنے دینا ہے تو جب اس کا خیال آجاتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے اور یہ چیز ذہن کے اندر اتر جاتی ہے، وہ جو کام بھی کر رہا ہے، اس کو دھیان آرہا ہے، تو ظاہر ہے وہ کام کو بہتر طریقہ پر کرتا ہے، اس لیے کہ وہ ثواب کی امید رکھتا ہے، اور ثواب کی امید ہی انسان سے کام کراتی ہے، رمضان کے روزوں کے متعلق حدیث میں ہے:

”من صام رمضان ایمان و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه“

(جس نے رمضان کا روزہ ایمان اور ثواب کی نیت سے رکھا اس کے تمام سابقہ گناہ معاف کردیے جائیں گے)(۱)

آدمی کھانا پینا کیوں چھوڑتا ہے؟ اسی لیے کہ اللہ کی طرف سے کچھ ملنے والا ہے، اگر معلوم ہو جائے کچھ ملنا ہی نہیں ہے، اللہ کی رضا اس سے متعلق ہی نہیں ہے، تو کام سے دلچسپی کیسے ممکن ہے، کوئی بھی اچھا کام ہو اس سے دلچسپی اسی لیے ہوتی ہے کہ آدمی سمجھتا ہے اس سے اللہ کی رضا ملنے والی ہے اور اللہ کی رضا کا مطلب ہے کہ سب کچھ ملنے والا ہے، اگر اللہ کی رضا مل جائے گی تو پھر سب کچھ مل جائے گی، اس لیے کہ رضا ہی اصل ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ (التوبة: ۷۲)

(اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑھ کر ہے)

---

(۱)البخاری، کتاب الصوم، باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا و نیة: ۱۹۰۱

سب سے بڑی چیز اللہ کی رضا ہے، لہٰذا جب آدمی کوئی بھی کام کرتا ہے اور یہ دھیان ہوتا ہے کہ ہمارا مالک ہم کو دیکھ رہا ہے تو اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر کرتا ہے اور یہی "احسان فی العمل" ہے، یعنی اس کے نتیجہ میں ہر کام کے اندر احسان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت مل جائے تو اس سے بڑی کون سی کیفیت ہو سکتی ہے، آدمی ہر وقت محسوس کرے کہ اللہ اس کے سامنے ہے، ظاہر ہے اس کے بعد گناہ سے بچنا کتنا آسان ہو جائے گا، ایسا انسان گناہ کے قریب ہوگا تو فوراً محسوس کرے گا کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔

رب کی برہان

حضرت یوسف علیہ السلام کا جو قصہ ہے جس میں آتا ہے کہ برائی ان کی طرف بھاگ رہی تھی، گویا برائی ان کو دوڑا رہی تھی اور ان کا پیچھا کر رہی تھی، لیکن ان کے لیے کون سی چیز مانع ہوئی؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود فرمایا:

﴿لَوْ لَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ﴾ (یوسف: ۲۴)

(اگر انھوں نے اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لی ہوتی)

یعنی اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے تو خطرہ میں پڑ جاتے، رب کی برہان کیا ہے؟ اس سلسلہ میں حضرات مفسرین نے مختلف باتیں لکھی ہیں، لیکن اگر یہ بات کہی جائے کہ برہان رب اللہ تعالیٰ کی گویا حضوری کی وہ آخری کیفیت تھی جس میں گویا انہوں نے خدا کو دیکھ لیا، اور ظاہر ہے جب انسان کے ہر ہر کام میں اللہ کا دھیان اس قدر ہوتا ہے تو آدمی اللہ کو اپنے سامنے محسوس کرتا ہے، اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی گویا اللہ کو سامنے محسوس کر لیا، اور گناہ سے بچنا آسان ہو گیا، معلوم ہوا اگر کوئی شخص اس قدر اس کیفیت کو بڑھا لے، اور ہر وقت محسوس کرے کہ اللہ اس کے سامنے ہے اور وہ اللہ کے سامنے ہے، وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، تو

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، اسی لیے ذکر کی کثرت کرائی جاتی ہے، کیونکہ جب آدمی بار بار کسی کا نام لیتا ہے تو دل میں اس کی محبت اترتی ہے، جب بار بار نام لیتا ہے تو اس کا دھیان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ سامنے ہے، اسی لیے اللہ کا ذکر جو بار بار کرایا جاتا ہے وہ اس لیے ہے کہ زبان کے راستہ سے وہ دل و دماغ تک جائے، اور اندرون تک اترے، اور آدمی اس رنگ میں رنگ جائے اور وہ کیفیت پیدا ہو جائے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ پھر آدمی گناہوں سے بچتا ہے۔

توکل کیا ہے؟

إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ؛

(اور جب مانگو تو اللہ سے مانگو، اور جب مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو)

یہ توحید کا اعلیٰ معیار ہے، اگر تمہیں کوئی ضرورت ہے اور کسی بھی نوعیت کی استعانت چاہتے ہو تو اللہ سے سوال کرو، اسی سے استعانت چاہو، اس لیے کہ کام بنانے والی ذات اللہ کی ہے، دوسروں کی طرف نگاہ مت کرو، وسائل کو مت دیکھو، اسباب کو مت دیکھو، یہ الگ بات ہے کہ اسباب کو اختیار کرنے کا حکم ہے، لہٰذا اسباب اختیار ضرور کرو، لیکن تمہاری نگاہ اللہ پر ہونی چاہیے، تم اللہ سے مانگو، وہی تم کو دے گا، اگر تم کاروبار کر رہے ہو تو یہ سمجھو کہ کاروبار میں نفع جب ہوگا جب اللہ چاہے گا، تمہارا دھیان اللہ کی طرف لگا ہوا ہو، اگر تم بیمار ہو گئے اور علاج کرانا چاہتے ہو تو علاج ضرور کراؤ، شریعت میں اس کا حکم ہے، لیکن یہ سمجھو کہ شفا دینے والی ذات اللہ کی ہے، شفا اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سے مانگو، عام طور پر بعض جملے ڈاکٹر ایسے کہہ دیتے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ شرک بک رہے ہیں، مثلاً: ''فلاں مریض آیا تھا میں نے ٹھیک کر دیا''، حالانکہ ہم انسان کسی کو کیا خاک ٹھیک کریں گے، اگر اللہ نہ چاہے تو ہم اپنا سر پھوڑ دیں تب بھی ٹھیک نہیں کر سکتے، اسی لیے ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ ڈاکٹروں کی ٹیم لگ گئی، انہوں نے اپنے سارے اسباب اختیار کر لیے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اور وہ سب مل کر بھی

شفا نہ دے سکے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرنے والی ذات اللہ کی ہے، اسی پر یقین ہونا چاہیے، اسباب اختیار کرنے سے کوئی نہیں روکتا، اس کا حکم ہے، لیکن توکل کس کو کہتے ہیں؟ توکل کی تشریح یہ فرمائی گئی ہے کہ اونٹ باندھ لو پھر توکل کرو، گاڑی لاک کردو اس کے بعد مسجد میں آکر آرام سے بیٹھو، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ گاڑی کھلی چھوڑ آئے اور یہ سوچ کر بیٹھ گئے کہ اللہ پر توکل ہے، یہ تو چور کو دعوت دینا ہے، وہ لے کر چلا جائے گا، اگر تم نے کسی کونے میں دو لاکھ روپیے کھلے چھوڑ دیے اور اپنا سامان ایسا رکھا کہ اوپر پیسے ہی سامنے رکھے ہوئے ہیں، اور پھر یہ سوچو کہ ہم اللہ کی ذات پر توکل کرتے ہیں، یاد رہے شریعت میں یہ ہرگز مطلوب نہیں ہے، اللہ کا حکم ہے اسباب اختیار کرو، یہ دنیا دار الاسباب ہے، لیکن تمہاری نگاہ اللہ پر ہو، تم اللہ سے مانگو، اللہ سے مدد چاہو، اور یہ سمجھو کہ جو کچھ بھی تم اسباب اختیار کرتے ہو ان کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی ذات اللہ کی ہے، کسی چیز کے اندر فی نفسہٖ تاثیر نہیں ہے، وہ تاثیر اللہ کی دی ہوئی ہے اور اللہ جب چاہتا ہے تاثیر کو سلب کر لیتا ہے، آگ کا کام جلانا ہے، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے، اللہ نے فرمادیا کہ آگ کے اندر جو تاثیر ہے وہ سلب کر لی جائے، اسی لیے کام الٹا ہو گیا، جو آگ جلانے کا کام کرتی تھی وہ گل گلزار بن گئی اور ٹھنڈی ہو گئی، وہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں جو بھی چیزیں ہیں ان کے اندر اللہ نے تاثیر رکھی ہے، وہ تاثیر ذاتی نہیں ہے، بلکہ عطائی ہے، دنیا کے اندر جتنی بھی چیزیں ہیں، کسی کے اندر کوئی طاقت نہیں ہے، کسی کے اندر کوئی صلاحیت نہیں ہے، وہ صلاحیت اللہ کی دی ہوئی ہے، اللہ جب تک چاہتا ہے صلاحیت کو باقی رکھتا ہے، اور جب نہیں چاہتا تو سلب کر لیتا ہے۔

قابل اعتماد ذات

مذکورہ حدیث میں اسی لیے یہ بات کہی گئی کہ بس اللہ ہی کی طرف نگاہ رکھو، اسی سے مانگو، اسی سے مدد چاہو اور اس بات کا یقین رکھو کہ اگر ساری دنیا تمہیں نقصان

پہنچانے کے لیے جمع ہوجائے، اور اللہ نہ چاہتا ہوتو کوئی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچاسکتی، اوراسی طرح ساری دنیا تمہیں فائدہ پہنچانا چاہے، لیکن اگراللہ کا حکم نہیں ہے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچاسکتا، اس بات کا تم یقین رکھو، اس سے تمہیں طاقت پیدا ہوگی، تمہاراایمان بڑھے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اسباب چھوڑ دو، اسباب ضرور اختیار کرو، لیکن تمہاری نگاہ اسباب پرنہیں ہونی چاہیے، بلکہ تمہاری نگاہ مسبب الاسباب پر ہونی چاہیے، اس لیے کہ اسباب کے اندروہی تاثیر پیدا کرتا ہے، تم نفع کے سارے اسباب اختیار کرلو، اگراللہ کا حکم نہیں ہے تو نفع نہیں ہوگا، اسی طرح سارے اسباب تم کسی کونقصان پہنچانے کے اختیار کرلو، اگراللہ کا حکم نہیں ہے تو نقصان نہیں ہوگا، اس لیے کہ نفع ونقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے، لیکن انسان سے یہ مطالبہ ہے کہ اسباب کے اعتبار سے تم صحیح راستہ اختیار کرو، اگرتم سوچو کہ ندی میں کود جائیں، آگ میں اپنے آپ کوگرادیں، اگراللہ چاہے گا تو جلیں گے ورنہ نہیں جلیں گے، یہ تو خودکشی ہوگی، اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ تم جوکرسکتے ہوا تنا کرو، باقی اللہ تعالیٰ جو چاہے گا وہ کرے گا، اسباب کو ترک نہیں کرنا ہے، ان کواختیار کرنا ہے، لیکن ان پریقین نہیں رکھنا ہے، بلکہ ان پر ذرا بھی اعتمادنہیں رکھنا ہے، اعتماداوریقین صرف اللہ کی ذات پررکھنا ہے۔

خدائی فیصلے

رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ؛

(قلم اٹھ چکے اور صحیفے خشک ہوچکے)

یعنی اللہ کوتقدیر میں جوکچھ لکھنا تھاوہ لکھا جاچکا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوح محفوظ میں سب کچھ لکھ دیا، حدیث میں آتا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم پیدا کیا، اس سے فرمایا؛ لکھ، اس نے کہا: کیا لکھوں؟ پھراللہ نے اس سے لکھوایا جوکچھ بھی ازل سے ابد تک ہونا تھا، سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سے لکھوایا، اب وہ سب کچھ لوح

محفوظ میں ہے، جس کو ''اُم الکتاب'' کہا گیا ہے، اس میں ہر چیز ہے، اس کے اندر کوئی تغیر نہیں ہوتا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ﴾ (ق: ۲۹)

(میرے یہاں بات بدلی نہیں جاتی)

اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوتی، جو اللہ نے لکھ دیا وہ طے شدہ ہے، معلوم یہ ہوا کہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے اور طے شدہ ہے، ہمیں جو کہا گیا ہے ہمیں اتنا کرنا ہے، پھر نتیجہ اللہ کے حوالہ ہے، وہ جیسا چاہے گا اس طرح نتیجہ نکلے گا۔

توحید کا اعلیٰ معیار

”عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لِيَسْأَلْ أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا! حَتَّى يَسْأَلَ شِسْعَ نَعْلِهِ إِذَا انْقَطَعَ.“(۱)

(حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تم میں سے ہر شخص کو اپنی تمام ضرورتیں اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے، یہاں تک کہ جب اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ (ہی) سے مانگے)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہماری جو چھوٹی چھوٹی ضرورتیں ہیں ان کو بھی اللہ سے مانگنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے اس کو بھی اللہ سے مانگنا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جوتے کا تسمہ لے کر بیٹھ جائیں اور کہیں ”یا اللہ تسمہ بنا دے“ بلکہ جو تسمہ بنانے والا ہے اس کے پاس جانا ہوگا اور تسمہ بنوانا ہوگا، لیکن اس بات کا یقین رکھو کہ یہ سب جو کچھ ہو رہا ہے سب اللہ کے کرنے سے ہی ہو رہا ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ نہ چاہے تو نہ چھوٹا کام ہوسکتا ہے نہ بڑا کام ہوسکتا ہے۔

توحید کا حق

اسی طرح اگر آدمی کے پاس پیسے نہیں ہیں وہ پریشان ہے، اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے، تو دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، بلکہ اللہ کے سامنے

(۱) الترمذی، کتاب الدعوات، باب ”لیسأل أحدکم ربه حاجته کلها“: ٣٦٠٤

ہاتھ پھیلائے، پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مسخر کردیں گے، جو اس کی ضرورت کو پورا کریں گے، لیکن جب کوئی بندہ اس کی ضرورت پوری کر رہا ہو اور پھر یہ سوچے کہ ہم اس کا پیسہ نہیں لیں گے، تو یہ بھی غلط ہے، اس لیے کہ اگر اس بندہ سے نہیں لے گا جس کو اللہ نے بھیجا ہے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا، ظاہر ہے بندہ سے اس کو لینا ہی پڑے گا، یہ الگ بات ہے کہ بندہ سے نہ مانگے، لیکن جب اللہ سے مانگنے کے بعد کہیں سے مل رہا ہے تو اس کو اللہ کی طرف سے سمجھے، گویا اللہ نے اس کا انتظام کردیا، یعنی مانگنا اللہ سے ہے، ہر ضرورت اللہ کے سامنے رکھنی ہے، کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا ہے، کبھی کسی کو حاجت روا نہیں سمجھنا ہے، چھوٹی ضرورت ہو یا بڑی ضرورت ہو، سب اللہ کے سامنے رکھنی ہیں، یہ توحید کا حق ہے۔

مظاہر شرک سے اجتناب

”عَنْ عَدِيٍّ بْنِ حَاتِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي عُنُقِي صَلِيبٌ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ: يَا عَدِيُّ! اطْرَحْ عَنْكَ هَذَا الْوَثَنَ، وَسَمِعْتُهُ يَقْرَأُ فِي سُورَةِ بَرَاءَةَ: ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ﴾ قَالَ: إِنَّهُمْ لَمْ يَكُونُوا يَعْبُدُونَهُمْ، وَلَكِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا أَحَلُّوا شَيْئاً اسْتَحَلُّوهُ، وَإِذَا حَرَّمُوا شَيْئاً حَرَّمُوهُ.“(۱)

(حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (فرماتے ہیں) کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کا صلیب پڑا ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عدی! اس بت کو (اپنے گلے سے اتار کر) پھینک دو، میں نے آپ ﷺ کو "سورۃ البراءۃ" کی یہ آیت پڑھتے سنا ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ﴾ (انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر عالموں اور راہبوں کو خدا بنالیا) پھر ارشاد فرمایا: وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کردیتے تو یہ لوگ حلال سمجھنے لگتے اور جب کسی چیز کو ان پر حرام کرتے تو یہ اس کو حرام سمجھتے)

حضرت عدی بن حاتم دربار رسالت میں تشریف لائے، اور ان کی گردن میں

(۱) سنن الترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ التوبۃ: ۳۰۹۵

سونے کی صلیب لٹک رہی تھی، ظاہر ہے ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ناجائز ہے اور شرک کی بات ہے، وہ سونے کی صلیب تھی، ان کو اچھی لگی اس لیے اس کو گردن میں ڈال لیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اتار پھینکو، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بت قرار دیا، اس لیے کہ صلیب شرک کی ایک علامت ہے، اور شرک سے متعلق جتنی بھی چیزیں ہیں، اگر ان میں ادنیٰ شرک کا شائبہ بھی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، صلیب چونکہ عیسائیوں کی ایک علامت ہے، اور اس میں شرک اس اعتبار سے ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے ان کو پھانسی دی گئی، جس کی انہوں نے ایک خاص علامت بنالی ہے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، اور صلیب کو اس کی ایک علامت سمجھتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ وہ شرک کی ایک علامت ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جتنے دوسرے مذاہب ہیں، ان کی جو بھی علامتیں ہوں، چونکہ وہ علامتیں ایک طرح سے شرک سے وابستہ ہیں، اس لیے ان علامتوں سے بچنے کی ضرورت ہے، مثلاً: ہندوؤں کے یہاں سندور لگاتے ہیں، جینو باندھتے ہیں اور ہاتھ میں لال دھاگا باندھتے ہیں وغیرہ وغیرہ، غرض کہ اس طرح کے جو بھی کام ہیں، جو ان کے مذہبی شعائر ہیں ان تمام شعائر سے بچنا ضروری ہے، خواہ وہ شعائر یہودیوں کے ہوں، عیسائیوں کے ہوں یا دوسرے مذاہب کے ماننے والے کے ہوں، ان کے جتنے بھی شعائر اور علامتیں ہیں ان کو اختیار کرنا گویا شرک کی علامت کو اختیار کرنا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے ان تمام چیزوں سے منع فرمایا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات ہے جس کا مسلمانوں کو خاص دھیان رکھنا چاہیے، وہ یہ کہ بازاروں میں جو سامان ملتا ہے، اس میں عام طور پر اس طرح کے دھوکے ہوتے ہیں، ان سامانوں پر کبھی صلیب بنی ہوتی ہے، کبھی چھ گوشے کا تارہ بنا ہوتا ہے جو یہودیوں کا نشان ہے، تو اس کا دھیان رہے کہ آدمی کم از کم جانتے بوجھتے

ایسا کوئی کام نہ کرے کہ وہ شرک کی علامت کو اپنے گھر میں لا کر لٹکا لے، حاصل بحث یہ کہ ان چیزوں سے بچنا اور ان کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔

اہل کتاب اور اہل اسلام میں فرق

حضرت عدی بن حاتم فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کو میں نے یہ آیت پڑھتے ہوئے بھی سنا؛

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ﴾(التوبة: ۳۱)

(انھوں نے اپنے علماء اور اپنے بزرگوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا)

یعنی اہل کتاب نے اپنے علماء اور اپنے درویشوں کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب بنالیا، لہٰذا انہوں نے جو کہا وہ ان لوگوں کو کرنا ہے، چاہے وہ شرک کی بات ہو یا کفر کی یا الحاد کی، یا وہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی بتائی ہوئی باتوں سے ہٹ کر ہو، انہوں نے بس یہ سمجھا کہ اصل یہی ہے، یہ جو علماء ومشائخ ہیں، جو ہمیں درویش نظر آرہے ہیں، یہی اصل ہیں، یہ جو کہہ دیں گے وہی دین ہے، لیکن مذہب اسلام کی جو تعلیمات ہیں اس سے بالکل ہٹ کر ہیں، اسلام یہ کہتا ہے کہ کتاب وسنت اصل ہے اور علماء ترجمان ہیں، یہ علماء کتاب وسنت کی ترجمانی کرتے ہیں، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کہتے ہیں اور ان کی بات ماننا لازم ہے تو پھر یہ بات شرک کے قریب پہنچ جائے گی، درحقیقت اطاعت اللہ کی ہے، اطاعت اللہ کے رسول ﷺ کی ہے، البتہ علماء کی اطاعت اس لیے ہے کہ وہ کتاب وسنت کے ترجمان ہیں، وہ اللہ اور رسول ﷺ کی بات بتاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں اور غور کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی وضاحت کرتے ہیں، اس لیے علماء کی بات مانی جاتی ہے، ائمہ کی تقلید اسی لیے کی جاتی ہے کہ ہمارا یہ یقین ہے، اس بات کو ہم سمجھتے ہیں، اور تجربے سے یہ بات ہمارے سامنے آئی ہے کہ ان حضرات ائمہ نے کتاب وسنت کی تنقیح کے بعد، اس کا زبردست گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے سامنے مسائل کو لاکر رکھا ہے، وہ مسائل

انہوں نے اپنے ذہن ودماغ سے نہیں بیان کیے ہیں، بلکہ وہ مسائل انہوں نے کتاب وسنت سے بیان کیے ہیں، اور اس کے لیے انہوں نے زبردست محنت کی ہے، اس کی دسیوں مثالیں موجود ہیں۔

ائمہ مجتہدین کی محنتیں

حضرت امام شافعیؒ کا مشہور قصہ ہے، حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں وہ ایک مرتبہ تشریف لے گئے، امام شافعیؒ امام احمدؒ کے استاد تھے، اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے بیٹوں سے ان کا بڑا تذکرہ کر رکھا تھا کہ ہمارے ایک بہت ذی استعداد استاد ہیں، لہٰذا جب وہ تشریف لائے تو ان کے بیٹے بڑے خوش ہوئے کہ آج ایک بڑی شخصیت کی خدمت کا موقع ملا ہے، غرض کہ جب رات کا وقت ہوا تو امام شافعیؒ کو آرام کرنے کی جگہ بتادی گئی، اور ایک لوٹے میں پانی رکھ دیا گیا کہ صبح تہجد کے لیے اٹھیں گے تو وضو کرلیں گے، چنانچہ جب صبح ہوئی تو ان کے بیٹے نے جا کر کہا: حضرت! نماز کا وقت ہو رہا ہے، لیکن انہوں نے دیکھا کہ لوٹے میں اسی طرح پانی بھرا رکھا ہے جیسا رکھا گیا تھا، اس پر ان کو بہت تعجب ہوا کہ لگتا ہے حضرت ابھی تک سو ہی رہے ہیں، تہجد وغیرہ میں بیدار نہیں ہوئے، کیونکہ اس وقت بھی وہ چارپائی پر ہی لیٹے تھے، پھر اس کے بعد امام شافعیؒ اٹھے اور سیدھے مسجد چلے گئے، امام احمدؒ نے کہا: حضرت نماز پڑھادیجئے، وہ فوراً آگے بڑھ گئے نماز پڑھانے کے لیے، ادھر ان کے بیٹے کو بڑا تعجب ہوا کہ وضو بھی نہیں کیا اور لگتا ہے بغیر وضو کے نماز پڑھادی، آخر یہ کیا قصہ ہے!! پھر جب سب لوگ نماز سے فارغ ہوگئے تو امام شافعیؒ سے گفتگو شروع ہوئی، اثناء گفتگو امام شافعیؒ نے فرمایا: ابوعبداللہ! رات عجیب بات ہوئی، ایک حدیث ہمارے ذہن میں آئی اور اس کے بعد ہم نے اس سے مسائل کا استنباط شروع کیا تو ہم مسائل کا استنباط کرتے رہے، اور تقریباً اس سے سو (۱۰۰) مسئلے نکالے، یہاں تک کہ فجر کی اذان ہوگئی، یہ سننے کے بعد امام احمدؒ کے بیٹے کو معلوم ہوا کہ وہ رات بھر ایک

دوسرے ہی کام میں لگے ہوئے تھے، گویا امت کی فکر میں لگے ہوئے تھے کہ امت کے لیے ان کو مسائل کا استنباط کرنا ہے۔

حضرت امام محمدؒ کا مشہور قصہ ہے کہ وہ رات رات بھر جاگتے تھے، اور مسائل کا استنباط کرتے تھے، اور اگر نیند آتی تھی تو ٹب میں پانی بھر کر بیٹھ جاتے تھے، اگر لوگ کہتے کہ حضرت ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو فرماتے: لوگ اس امید میں سو رہے ہیں کہ محمد جاگ رہا ہوگا، اگر میں بھی سو جاؤں گا تو امت کا کیا ہوگا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان ائمہ مجتہدین کی غیر معمولی قربانیاں ہے، انہوں نے اپنی طرف سے باتیں نہیں نکالی ہیں، بلکہ انہوں نے قرآن و حدیث کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا ہے، اللہ نے ان کو ایسے زبردست ذہن عطا فرمائے تھے کہ وہ دقیق مسائل کا استنباط کر سکتے تھے۔

فضل خداوندی

امت مسلمہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک خاص فضل ہے، جو فضل کسی امت پر نہیں، وہ یہ کہ جب جیسے افراد کی ضرورت پڑی، اللہ نے اس طرح کے افراد امت کو عطا کیے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے "تاریخ دعوت وعزیمت" میں یہ بات بہت طاقت کے ساتھ لکھی ہے، اس کے علاوہ اگر ہم اور آپ دو چیزوں پر خاص طور سے غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس امت پر اللہ کا خصوصی فضل ہوا ہے، وہ یہ کہ پہلے مرحلہ پر قوت حفظ کی ضرورت تھی، تاکہ اللہ کے رسول ﷺ کی جو حدیثیں ہیں، ان کا ایک ایک نکتہ محفوظ ہو جائے، اور اس میں ذرا بھی کمی وزیادتی نہ ہو، تو اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کو غیر معمولی حافظے عطا فرمائے، اس زمانہ کے لوگوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔

حضرت امام زہریؒ کے بارے میں آتا ہے فرماتے تھے کہ میں بازار سے گذرتا ہوں تو کان میں روئی ٹھوس لیتا ہوں، تاکہ وہاں کی باتیں میرے کان میں نہ

پڑ جائیں، کیونکہ جب کوئی بات کان سے سن لیتا ہوں تو نکلتی ہی نہیں ہے، اور دماغ میں گردش کرتی رہتی ہے، اسی طرح ایک اور عجیب وغریب واقعہ ہے، اس پر بھی یقین نہیں آتا، لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ واقعۃً اس امت کے ساتھ اللہ کا خاص فضل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑے محدث تھے، ان کا طالب علمی کا دور تھا، چنانچہ جب وہ مسجد نبوی میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ دو جگہ درس ہو رہا ہے، اور دونوں جگہ بڑے علماء ہیں جو حدیثیں بیان کر رہے ہیں، وہ پریشان ہوئے کہ میں کیا کروں، کس کے پاس جا کر بیٹھوں، ادھر بیٹھوں گا تو ان کی حدیثیں چھوٹیں گی، اور ادھر بیٹھوں گا تو ان کی حدیثیں چھوٹیں گی، لہٰذا بہت سوچنے کے بعد وہ بیچ میں جا کر بیٹھے، اور ایک کان سے ان کی حدیثیں سن رہے تھے اور ایک کان سے ان کی حدیثیں سن رہے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ جب دونوں کے دروس ختم ہوئے اور ان کے شاگردوں سے انہوں نے مذاکرہ کیا تو من وعن دونوں کی حدیثیں سنا دیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس امت پر یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص فضل ہے اور آنحضرت ﷺ کا اعجاز ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ دین باقی رکھنا تھا، تو اللہ نے ایسے اسباب پیدا کیے، جن سے حفاظت کا سامان ہو سکے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا جب قوت حفظ کی ضرورت تھی تو اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد پیدا کر دیے، جن کے حالات و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت حفظ کے خارق عادت واقعات ہیں، ان پر یقین کرنا مشکل ہے، لیکن جب اس کی ضرورت تھی تو اللہ تعالیٰ نے قوت حفظ فرمائی، اور اس کے بعد جب استنباط کی ضرورت پڑی تو ایسے اذکیائے عالم پیدا کر دیے، ایسے ذہین لوگ پیدا کر دیے کہ میں سمجھتا ہوں تاریخ میں ایسے ذہین لوگ ملنا مشکل ہے، امام ابوحنیفہؒ جیسا آدمی جن کے بارے میں امام مالک کہتے تھے کہ اگر وہ ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو سونے کا ثابت کر دیں، ان جیسے ذہین لوگ پیدا کیے، انہوں نے کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا، ان کا یہی کام تھا، انہوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، لہٰذا اس بات کو سمجھنے کی

ضرورت ہے کہ ہمارے یہ علماء اور ہمارے یہ ائمہ یہ دراصل کتاب وسنت کے ترجمان ہوتے ہیں، یہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے۔

گمراہ کن روش

مذکورہ حدیث میں جو بات آپ ﷺ نے قرآن کی زبانی ارشاد فرمائی کہ؛

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ﴾(التوبة: ۳۱)

(انھوں نے اپنے علماء اور اپنے بزرگوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا)

یہ یہودیوں کا طریقہ تھا، عیسائیوں کا طریقہ تھا، لیکن اس امت کا یہ طریقہ نہ رہا ہے اور نہ اب ہے، لیکن بہت سے گمراہ لوگ ہیں جو اس پر گویا یقین رکھتے ہیں، بہت سے علاقوں میں معلوم ہوا کہ پیر صاحب گئے اور جا کر نمازیں معاف کردیں، کہیں روزے معاف کردیے، کہیں اپنی طرف سے کچھ بات نکال دی، ظاہر ہے یہ تو وہی بات ہوگئی جو عقیدہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تھا، وہی عقیدہ گویا اس امت کے بعض لوگوں کا پیدا ہوگیا، یاد رہے یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے کہ کسی عالم کو آدمی شارع سمجھے، وہ یہ یقین کرے کہ یہ جو کہیں گے وہ شریعت ہے، معلوم ہونا چاہیے کسی کا کہا شریعت نہیں ہے، علماء شریعت کی بات کہتے ہیں، شریعت کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اگر کوئی عالم شریعت کی ترجمانی نہیں کررہا ہے تو اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، ہمارا تعلق کسی عالم سے صرف اس لیے ہے کہ وہ شریعت کا ترجمان ہے، اب اگر کوئی عالم غلط بات کہہ رہا ہے تو ہم اس کی بات ہرگز نہیں مانیں گے۔

ایک ضروری وضاحت

مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے اس کی وضاحت بھی فرمادی کہ اہل کتاب نے ان کو مطلق رب نہیں بنایا تھا، رب بنانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ان کی پرستش کرتے تھے، ان کی بندگی کرتے تھے، لیکن ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کے علماء کسی

چیز کو حلال کر دیتے تو وہ حلال ہو جاتی اور جب کسی چیز کو حرام کر دیتے تو وہ حرام ہو جاتی، جب کہ کسی چیز کو حرام کرنے کا اختیار ان کو نہیں ہے، یا کسی چیز کو حلال کرنے کا اختیار ان کو نہیں ہے، ان کا کام تو صرف اتنا ہے کہ جو کہا گیا ہے اس بات کو واضح طریقہ پر ایسے لوگوں کے سامنے بیان کر دیں جو نہیں سمجھ رہے ہیں، تاکہ ان کے لیے سمجھنا آسان ہو جائے، اس سے آگے کوئی دوسرا کام نہیں۔

مسجود حقیقی

”عَنْ قَيْسِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَتَيْتُ الْحِيرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِمَرْزُبَانٍ لَهُمْ، فَقُلْتُ: لَرَسُوْلُ اللّٰهِ أَحَقُّ أَنْ يُسْجَدَ لَهٗ، فَأَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ: إِنِّي أَتَيْتُ الْحِيرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِمَرْزُبَانٍ لَهُمْ، فَأَنْتَ أَحَقُّ أَنْ يُسْجَدَ لَكَ، فَقَالَ لِيْ: أَرَأَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِيْ أَ كُنْتَ تَسْجُدُ لَهٗ؟ فَقُلْتُ: لَا، فَقَالَ: لَا تَفْعَلُوْا.“(۱)

(حضرت قیس بن سعد بن عبادہ خزرجی انصاری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: میں (مقام) حیرہ گیا، تو وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ تو زیادہ حق دار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، اس کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ (اے اللہ کے رسول ﷺ) میں حیرہ گیا تھا، (تو میں نے وہاں یہ) دیکھا کہ وہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں، آپ تو کہیں زیادہ حق دار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ اگر تم میری قبر کے پاس سے گذرے تو کیا اس کو سجدہ کروگے؟ میں نے عرض کیا: نہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا: تم (لوگ) ایسا نہ کرو)

---

(۱)سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في حق الزوج على المرأة: ۲۱۴۰

حیرہ شام میں ایک جگہ کا نام ہے، وہاں حضرت قیس بن سعد بن عبادہ انصاریؓ نے دیکھا کہ چند لوگ اپنے چودھری کو سجدہ کر رہے ہیں، یعنی جوان کا بڑا ذمہ دار ہے اس کو سجدہ کر رہے ہیں، چنانچہ جب وہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! میں حیرہ گیا تھا اور میں نے وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے چودھری کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، دنیا میں اس وقت آپ سے بڑا کون ہے؟

آپ ﷺ نے ایسے موقع پر اصلاح کا نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار فرمایا، اصلاح کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ آپ ﷺ سیدھے سیدھے فرما دیتے تم کیسی غلط بات کہہ رہے ہو، یہ بالکل جائز نہیں ہے، یہ تو کھلا شرک ہے، آپ ﷺ نے ایسا کچھ نہیں کہا، بلکہ آپ ﷺ نے ان کو سمجھا دیا تا کہ وہ چیز ان کے دل و دماغ میں اتر جائے، اور یہ واقعہ پوری امت کے لیے ایک سبق بن جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، وہ یہ کہ اگر میرا انتقال ہو جائے تو کیا تم میری قبر کے پاس سے گذرتے ہوئے سجدہ کرو گے؟ یہاں یہ بھی غور کی بات ہے کہ آپ ﷺ نے گویا ایک واضح بات فرما دی کہ میں باقی رہنے والا نہیں ہوں، باقی رہنے والی ذات اللہ کی ہے، اس کے علاوہ سب کو فنا ہونا ہے، میرا بھی انتقال ہو جائے گا، لہٰذا اب تم یہ بتاؤ کہ جب میری قبر کے پاس سے گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟ چونکہ صحابہ کا ذہن بن چکا تھا، اور حضرت قیسؓ کا بھی ذہن بنا ہوا تھا، لہٰذا انہوں نے صاف کہا: ایسا تو نہیں ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا: اب اس بات کو سمجھ لو کہ جب تم میری قبر کو سجدہ نہیں کرو گے تو اب تم مجھے زندہ ہونے کی حالت میں کیوں سجدہ کرو گے؟ ایسا کرنا تمہارے لیے درست نہیں ہے، جب تم اس بات کو سمجھ گئے کہ میں بھی اس دنیا سے چلا جاؤں گا، اور قبر میں ہوں گا، اور اس وقت تم مجھے سجدہ نہیں کرو گے، گویا میری تعلیمات تمہارے دماغ میں آ چکی ہیں، تو اب تم بتاؤ کہ جب میں زندہ ہوں تو تم مجھے کیسے سجدہ کر سکتے ہو؟

ممانعتِ سجدہ کی حکمت

معلوم ہوا باقی رہنے والی ذات اللہ کی ہے، اس کو سجدہ کیا جائے گا، اس کے علاوہ کسی کے لیے سجدہ روا نہیں ہے، اس لیے کہ سجدہ انتہائی تعظیم ہے، اور انتہائی تعظیم صرف رب کے لیے ہے، صرف اللہ کے لیے ہے، کسی دوسرے کے لیے انتہائی تعظیم نہیں ہوتی ہے، اس حدیث میں آپ ﷺ نے بات واضح کردی کہ نہ تو کسی زندہ کو سجدہ کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی قبر کو سجدہ کیا جاسکتا ہے، جب آپ ﷺ نے اپنے بارے میں یہ بات کہہ دی، تو ظاہر ہے اس کے بعد کسی ولی کی قبر کو سجدہ کرنا یا کسی پیر کے آگے جا کر سجدہ کرنا اور قدم بوسی اس انداز سے کرنا کہ گویا وہ سجدہ ہوجائے، یہ سب مظاہر شرک میں شامل ہے، اور امت آج اس میں مبتلا ہورہی ہے، کتنے لوگ ہیں جو سجدے کرواتے ہیں، پیر چومواتے ہیں، گویا وہ بھی ایک طرح کا سجدہ ہی ہوجاتا ہے، اور قبروں کے سامنے جا کر سجدے کرتے ہیں، اور جب ان سے بات کہی جاتی ہے کہ یہ اعمال شرک ہیں، تو کہتے ہیں یہ تو تعظیمی سجدہ ہے، جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو ان کاموں سے منع کردیا، بعض بعض گذشتہ امتوں میں تعظیمی سجدہ کی اجازت تھی، لیکن اب یہ اجازت اس لیے ختم ہوگئی کہ یہ دین آخری دین ہے، قیامت تک چلنے والا ہے، ساری دنیا میں پھیلنے والا ہے، اس میں ہزار خطرات تھے کہ اگر تعظیمی سجدہ کی اجازت دی جاتی تو یہ بات شرک تک پہنچ جاتی، اسی لیے اس کی جڑ ہی کاٹ دی گئی، اور کہہ دیا گیا کہ اللہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی سجدہ جائز نہیں ہے۔

خطرہ کی گھنٹی

آپ ﷺ نے یہ بات حدیث پاک میں بیان فرما کر قیامت تک کے لیے یہ معاملہ صاف کردیا کہ کسی بھی نوعیت کا سجدہ ہو، سجدہ تعظیمی ہو، یا سجدہ احترامی ہو، یا سجدہ عبادت کا ہو، کسی کے لیے بھی سجدہ جائز نہیں ہے، سوائے اللہ کے، البتہ نیت کا

فرق ضرور ہے، کوئی عبادت کے لیے سجدہ کررہا ہے تو کھلا مشرک ہوگیا، اگر تعظیم کے لیے سجدہ کررہا ہے تو مشرکانہ عمل میں مبتلا ہوا، اب ایسے شخص کا کیا انجام ہوگا، اس کے بارے میں ہم کوئی بات نہیں کہہ سکتے، ہوسکتا ہے مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو، کیونکہ جب وہ ایک اللہ کے لیے ان مظاہر عبادت کو خالص نہیں کررہا ہے، اور دوسروں کو شریک کررہا ہے تو مرتے وقت لا الہ الا اللہ کس زبان سے کہے گا، توحید کا عقیدہ انسان کے ذہن ودماغ میں راسخ ہونا چاہیے، انسان جو بھی عمل اس عقیدہ کے خلاف کرتا رہا ہے، تو مرتے وقت توحید کا جو کلمہ ہے، کیا وہ کلمہ اس کی زبان سے نکلے گا، جو شرک پہلے عمل میں ہوا ہے، اس کا خطرہ ہے کہ مرتے وقت بھی پھر وہ کلمہ اس کو نصیب نہیں ہوگا، اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ اسی شرک کے ساتھ خدانخواستہ دنیا سے نہ چلا جائے، اس لیے یہ جو ساری مشرکانہ چیزیں ہیں، ان سے بچنا ہے، مشرکانہ اعمال سے بچنا ہے، جس طرح عقیدہ خالص ہونا چاہیے، اسی طرح جو اعمال عبادت ہیں یہ بھی اللہ کے لیے خالص ہونے چاہئیں، کسی کے لیے یہ اعمال عبادت جائز نہیں ہیں، ورنہ یہ اعمال آدمی کو شرک میں مبتلا کردیتے ہیں۔

اللہ کی شان عالی

"عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: أَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: جُهِدَتِ الْأَنْفُسُ، وَ جَاعَ الْعِيَالُ وَنُهِكَتِ الْأَمْوَالُ وَهَلَكَتِ الْأَنْعَامُ، فَاسْتَسْقِ اللّٰهَ لَنَا، فَإِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِكَ عَلَى اللّٰهِ وَنَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، فَمَا زَالَ يُسَبِّحُ حَتَّى عُرِفَ ذَلِكَ فِيْ وُجُوْهِ أَصْحَابِهِ، ثُمَّ قَالَ: وَيْحَكَ، إِنَّهٗ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِهٖ، شَأْنُ اللّٰهِ أَعْظَمُ مِنْ ذَلِكَ"(۱)

(حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا حضور لوگ پریشان ہیں، اہل وعیال بھوکے ہیں، مال ختم ہوگیا، جانور مر گئے، آپ اللہ سے ہمارے لیے بارش کی دعا فرمایئے، ہم آپ سے اللہ کے دربار میں سفارش کی درخواست کرتے ہیں، اور اللہ سے آپ کے دربار میں سفارش چاہتے ہیں، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ اللہ کی پاکی وبزرگی بیان کرنے لگے، اور برابر سبحان اللہ، سبحان اللہ فرماتے رہے، یہاں تک کہ اس کا اثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے چہروں پر ظاہر ہونے لگا، پھر آپ نے فرمایا: تمہارا برا ہو، تم کو سمجھنا چاہیے اللہ کی مخلوق میں سے

(۱)سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في الجهمية: ٤٧٢٦

کسی کے لیے اللہ تعالیٰ سے سفارش نہیں چاہی جاسکتی ہے، اللہ کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے)

جب پانی اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے دشواری ہوئی، تو ایک بدو نے آپ ﷺ سے اس کی شکایت کی اور دعا کی درخواست کی، اور اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم آپ کو اللہ پر سفارشی بناتے ہیں اور اللہ کو آپ پر سفارشی بناتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! سبحان اللہ! اور آپ ﷺ برابر یہی کہتے رہے؛ اللہ کی ذات پاک ہے، اللہ کی ذات پاک ہے، یہاں تک کہ اس کے اثرات آپ ﷺ کے صحابہ کے چہروں پر محسوس ہونے لگے، کیونکہ آپ ﷺ برابر سبحان اللہ سبحان اللہ فرمارہے تھے، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا؛ اے اللہ کے بندے! اللہ تبارک وتعالیٰ کی مخلوق میں کسی کے لیے اس کو سفارشی نہیں بنایا جاسکتا، اس کی شان اس سے بہت بلند ہے، سفارشی اس کو بنایا جاتا ہے جو کم درجہ کا ہو، اور اس کے لیے سفارشی بنایا جاتا ہے جو بلند درجہ کا ہو، گویا اس کو ایک وسیلہ یا زینہ بنایا جاتا ہے، اللہ کی ذات بلند ہے، لہٰذا اللہ کے لیے دوسروں کو سفارشی بنایا جاسکتا ہے، لیکن کسی دوسرے کے لیے اللہ کو سفارشی نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ یہ ترتیب ہی پلٹ گئی، گویا اس میں اللہ کی جو بلند ذات ہے اس کی شان کے لیے یہ چیز موافق نہیں ہے کہ اللہ کسی کے لیے سفارشی بنے، اس کو کسی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ جو چاہے کرے، سب کچھ اس کے اختیار میں ہے، اس کو کسی سے سفارش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ خود فیصلے فرماتا ہے، حکم فرماتا ہے، اس کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

تربیت کا دور

لیکن وہ شخص بدو تھا اور وں کی اُبدؤس انداز سے تربیت نہیں ہوئی تھی جس طرح صحابہ کرام کی ہوئی تھی، اسی لیے ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ وہ آپ ﷺ کے دربار میں آتے تھے اور بے ساختہ اپنی سادگی میں بہت سی باتیں کہتے تھے، آپ ﷺ ان

باتوں میں جن چیزوں کا تعلق آپ کی ذات سے ہوتا تھا ان کو کبھی برا محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ اس کا جواب دے دیتے تھے، لیکن جب مسئلہ کسی عقیدہ یا حکم کا آتا تھا تو آپ ﷺ بات کو واضح فرماتے تھے تا کہ سننے والے اور خود جو آنے والا ہے وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے یہاں بھی بات صاف کر دی، اس بدو نے جو کہا تھا وہ توحید کے عقیدہ کے منافی بات تھی، اور چونکہ وہ سیکھنے کا زمانہ تھا، آپ ﷺ صحابہ کی تربیت فرما رہے تھے، اور ظاہر ہے جو سیکھنے کا مرحلہ ہوتا ہے اس میں یہ مسائل پیش آتے رہتے ہیں کہ جب آدمی درمیان میں ہوتا ہے تو بہت سی چیزیں نہیں جانتا اور اَن جانے میں بہت سی باتیں کہہ دیتا ہے، لہٰذا اس دور میں جو باتیں اَن جانے میں کہی جائیں گی ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، اسی لیے اگر بدو کی بات کو دیکھا جائے تو وہ ایک طرح کی مشرکانہ بات تھی، لیکن چونکہ وہ تمرین وتدریب کا دور تھا، اس لیے آپ ﷺ نے بات واضح فرما دی اور یہ نہ کہا کہ تم دوبارہ کلمہ پڑھو، تم مشرک ہو گئے، بلکہ آپ نے غلط فہمی دور کر دی، اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ دور تربیت کا تھا اور لوگ سیکھ رہے تھے۔

معاملہ کی سنگینی

لیکن اب اگر کوئی اس طرح کی کھلی بات کہے گا تو وہ سخت ہو جائے گی، لہٰذا اس سے آگے کی بات کہی جاسکتی ہے کہ تم نے یہ مشرکانہ بات کہہ دی، تمہیں توبہ کرنی چاہیے، اپنے ایمان کو تازہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ اللہ کی ذات بہت بلند ہے، وہ معبود ہے، قادر مطلق ہے، اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ جو چاہے کرے، اس کو سفارش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ تو حکم دیتا ہے، جس طرح کوئی بادشاہ اپنے وزیر سے سفارش نہیں کرتا، یا کسی ماتحت سے جو اس کے آس پاس کے لوگ ہیں اور اس سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ان سے سفارش نہیں کرتا، اگر اس کو کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو وہ حکم دیتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ احکم الحاکمین ہے، وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے، اس کی قدرت

میں ہے، لہٰذا اس کو سفارش کی ضرورت نہیں ہے، وہ براہ راست حکم دے گا۔

فضائی آلودگی کا سبب

مذکورہ حدیث میں بدو نے آپ ﷺ کو اللہ کے لیے سفارشی بنایا اور آگے کی بات یہ کہہ دی کہ ہم اللہ کو آپ کے لیے سفارشی بناتے ہیں، آپ ﷺ نے اس پر نکیر فرمائی اور آپ ﷺ بار بار ''اللہ کی ذات پاک ہے، بلند ہے،'' کہتے رہے، تاکہ ظاہری طور پر فضا میں جو ایک گندگی آگئی ہے وہ دھل جائے اور پاک ہوجائے، اللہ کی شان عالی کے خلاف جو بات آئی ہے، فضا میں اس کا ایک اثر پڑ گیا ہے وہ اثر ختم ہوجائے، اسی لیے آپ ﷺ برابر سبحان اللہ فرماتے رہے، اس لیے کہ ہر چیز کا فضا پر اثر پڑتا ہے، اگر کوئی آدمی کوئی شرکیہ بات کہہ دے، یا الحادی کوئی بات کہہ دے، اس کا فضا پر اثر پڑتا ہے، جب تک کہ وہ اپنی بات سے اس کی نفی نہ کرلے، اس وقت تک اس کا اثر نہیں جاتا، اور فضا میں جو چیز پیدا ہوجاتی ہے تو یا کہنے والا خود کہے یا پھر کوئی دوسرا اس کی تردید کردے اور بات کو صاف کردے تب فضا صاف ہوجاتی ہے ورنہ فضا آلودہ رہتی ہے، اسی لیے مذکورہ قصہ میں آپ ﷺ نے برابر سبحان اللہ سبحان اللہ فرمایا، اور بات صاف کردی کہ اللہ کی ذات بہت بلند ہے، اس طرح کی وضاحت آپ ﷺ نے کئی جگہ فرمائی ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں، تو تم بھی اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو، کسی بھی طرح یہ محسوس نہ ہو کہ گویا اللہ اور رسول ﷺ دو برابر کے ہیں، بلکہ عبد و معبود کا جو فرق ہے، اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھو۔

اصلاح کا نبوی انداز

"عَنِ الرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَتْ: جَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ حِيْنَ بُنِيَ عَلَيَّ، فَجَلَسَ عَلىٰ فِرَاشِيْ كَمَجْلِسِكَ مِنِّيْ، فَجَعَلَتْ جُوَيْرِيَاتٌ لَنَا يَضْرِبْنَ بِالدُّفِّ، وَيَنْدُبْنَ مَنْ قُتِلَ مِنْ آبَائِيْ يَوْمَ بَدْرٍ، إِذْ قَالَتْ إِحْدَاهُنَّ: وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ، فَقَالَ: "دَعِيْ هَذِهِ وَقُوْلِيْ بِالَّذِيْ كُنْتِ تَقُوْلِيْنَ"(۱)

(حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور شب زفاف میں اس طرح میرے بستر پر بیٹھے جیسے آپ بیٹھے ہوئے ہیں، اتنے میں ہماری کچھ بچیاں دف بجانے لگیں، اور ہمارے باپ دادوں میں جو کام آئے تھے ان کی مرثیہ خوانی کرنے لگیں اتنے میں ایک لڑکی نے کہا: اور ہم میں ایک ایسے نبی ہیں جو کل کی بات جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ چھوڑ دو (مت کہو) وہ کہو جو تم کہہ رہی تھیں)

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہمارے یہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، جہاں میری شادی ہوئی تھی، یا ولیمہ ہوا تھا، اور میرے بستر پر آپ تشریف فرما ہوئے جس طرح تم بیٹھے ہو(۲) تو کچھ بچیوں نے دف بجانا شروع

---

(۱)صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والولیمة: ٥١٤٧

(۲)راوی کو خطاب کر کے حضرت ربیع فرما رہی ہیں۔

کیا اور بدر کے دن جو ہمارے باپ چچا شہید ہوئے تھے، ان کا وہ کچھ تذکرہ کرنے لگیں اور ان کے محاسن وغیرہ بیان کرنے لگیں، انہیں اشعار میں کسی نے یہ شعر بھی پڑھ دیا کہ "وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ" یعنی ہم میں ایک نبی ہیں جو کل کی بات بھی جانتے ہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شعر سنا تو فرمایا: یہ چھوڑ دو اور جو اشعار تم پڑھ رہی تھیں ان کو پڑھتی رہو۔

اظہار مسرت کے حدود

اس حدیث میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ خوشی کے موقع پر اگر کوئی اشعار پڑھتا ہے اور دف کے ساتھ گاتا ہے، تو اس میں حرج کی بات نہیں، بلکہ یہ اظہار مسرت کا ایک طریقہ ہے، اور انصار میں اس کا بہت رواج تھا، عام طور سے شادیوں میں وہ ضروری سمجھتے تھے کہ کچھ گانے والے، اشعار پڑھنے والے ہوں، وہ دف بجا بجا کر گائیں اور خوشی کا اظہار ہو، یہاں تک بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی انصاری کے یہاں شادی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: کیا وہاں دف ہے؟ یعنی کیا وہاں گانے والے یا اشعار پڑھنے والے پہنچے؟ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند نہیں کیا، بلکہ اس کی تائید فرمائی، یہاں بھی یہی صورت تھی کہ وہ ان کا شادی کا گھر تھا، جہاں ان کا ولیمہ ہوا تھا، وہاں لوگ آئے ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ کچھ بچیاں اشعار پڑھ رہی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گانے اور اشعار پڑھنے پر نہیں روکا، اور کوئی ممانعت نہیں فرمائی اور دف بجانے پر بھی کوئی ممانعت نہیں کی، بلکہ ایک غلط شعر پڑھنے پر روکا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایسے موقع پر اچھے اشعار پڑھے جائیں یا گائے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

احتیاط کے پہلو

البتہ چند چیزوں کا لحاظ ضروری ہے، ایک تو یہ کہ آلات مزامیر نہ ہوں، یعنی آج

کل جو میوزک کے آلات ہیں ان کا استعمال نہ کیا جائے، اس لیے کہ ان میں شر کا پہلو ہے، اس طرح کے جو آلات ہوتے ہیں، ان کے بجانے سے غلط خیالات پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور آپ ﷺ نے ان کو بعض روایات میں شیطان کے آلات قرار دیا ہے، اور ان سے منع فرمایا ہے، اور چونکہ اس میں شر کا اندیشہ ہے، اس لیے بھی یہ درست نہیں ہے کہ اس طرح کے آلات کا استعمال کیا جائے، مزامیر کے آلات پہلے بھی تھے، البتہ آج کل تو بہت ترقی ہوگئی ہے، اور یہ بالکل ایک فن بن گیا ہے، لہٰذا اس طرح کے آلات کا استعمال درست نہیں ہے، البتہ دف بجانا جائز ہے، دوسری بات یہ کہ جو اشعار جو پڑھے جائیں وہ نامناسب نہ ہوں، جیسے آپ ﷺ کے سامنے جب شرکیہ شعر پڑھا گیا تو آپ نے فوراً ٹوکا، لہٰذا اشعار میں کوئی شعر شرکیہ نہ ہو، اس میں کوئی الحاد و بے حیائی کی بات نہ ہو، ایسی صورت میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر اشعار سادے ہوں اور اچھے ہوں، خواہ نعت کے ہوں یا غزل کے تو ان کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ان کو گایا جا سکتا ہے، اور تیسری بات یہ ہے کہ پڑھنے والا ایسا ہو کہ اس میں کسی قسم کے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، یعنی پڑھنے والی کوئی خاتون نہ ہو، بالغ نوجوان لڑکیاں نہ ہوں، اس لیے کہ اس میں فتنہ کا قوی اندیشہ ہے، کیونکہ جب وہ سامنے بیٹھ کر پڑھیں گی تو اولاً پردہ کا مسئلہ ہوگا، اور اگر سامنے نہیں پڑھیں گی، بلکہ پردے کے ساتھ پڑھیں گی تو جس طرح فتنہ کا اندیشہ صورت سے ہوتا ہے اسی طرح صوت (آواز) سے بھی ہوتا ہے، لہٰذا جب نامحرم نوجوان لڑکیاں اپنی آواز کو مترنم بنا کر اور اس میں حسن پیدا کر کے گائیں گی تو ظاہر بات ہے کہ اس بات کا قوی خطرہ ہوگا کہ کسی کے دل میں برا خیال پیدا ہو جائے، لہٰذا اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر گانے والی چھوٹی بچیاں ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے، یا اگر مرد ہیں اور ان میں بھی کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر فتنہ کا اندیشہ ہے تو بچنا چاہیے، آپ ﷺ کے ارشادات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

سامعین کا فرق

یہ چند چیزیں ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اسی طرح سننے والوں کا بھی مسئلہ ہوتا ہے، بعض مرتبہ سننے والے اچھا دل رکھ کر سنتے ہیں اور بعض مرتبہ سننے والے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ تحمل نہیں کر سکتے، بعض غزلیہ اشعار پڑھے جا رہے ہیں، پڑھنے والا بہت اچھی آواز میں پڑھ رہا ہے، لیکن سننے والے الگ الگ طرح کے ہوتے ہیں، بعض سننے والے ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کے عشق میں ڈوبے ہوتے ہیں، ان کے نزدیک ہر شعر اللہ کے عشق کا شعر ہے، ان کو اس سے نفع ہوتا ہے، بعض وہ ہوتے ہیں جن کے دلوں کے اندر روگ ہے، ان کے ذہن غلط جاتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے اس طرح کے اشعار سننا بھی مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے ذہنوں میں غلط خیالات کے آنے کا اندیشہ ہے، اور جن لوگوں کے اندر اللہ کے عشق کی آگ بھری ہوئی ہے، ان کے ذہنوں میں اس طرح کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، اس لیے وہ سن سکتے ہیں۔

حاصل بحث یہ کہ اگر مجلس ایسی ہے جس میں سننے والے گویا سب محارم ہیں، یعنی سب صحیح دل رکھنے والے ہیں تو اس میں شاید ایسی احتیاط کا مسئلہ نہیں ہوگا، لیکن جہاں عام لوگ ہیں وہاں بچنا چاہیے، وہاں ایسے اشعار ہی نہ ہوں جن کا لوگ غلط مفہوم لیں، ان چند چیزوں کا دھیان اس میں ضروری ہے، چونکہ اس دور میں اس کا رواج بہت ہے، اور میوزک کا بڑا رواج ہو گیا ہے، اور اس کی طرح طرح کی شکلیں آ گئی ہیں، لہٰذا واضح رہے کہ میوزک کا استعمال بالکل صحیح نہیں ہے، ہمارے بعض متساہلین نے اس کی بعض شکلوں کو جائز قرار دیا ہے، لیکن احتیاط یہی ہے کہ آدمی بچے، میوزک کی تمام شکلیں شبہ کی ہیں اور اس سے فتنہ میں پڑ جانے کا خطرہ ہے۔

عالم الغیب کون؟

مذکورہ روایت میں دوسری اہم بات جس کے لیے روایت نقل کی گئی ہے وہ یہ ہے

کہ جب ایک شعر پڑھا گیا کہ ہم میں ایک ایسے نبی ہیں جو کل کی بات جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے فوراً نکیر فرمائی اور کہا؛ یہ شعر مت پڑھو، اس لیے کہ اس میں ایک طرح کا شرک ہے، غیب کا علم رکھنے کی صفت اللہ کی ہے، وہ عالم الغیب والشہادہ ہے، وہ سب باتیں جانتا ہے، کل کیا ہونے والا ہے وہ جانتا ہے، گذشتہ صفحات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ گذر چکی ہے کہ کوئی نہیں جانتا وہ کل کیا کرنے والا ہے، کسی کے علم میں نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے، اور یہ بات نہ نبی جانتا ہے اور نہ ولی جانتا ہے، لہٰذا جب یہ شعر پڑھا گیا کہ ایسے نبی ہیں جو کل کی بات جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے اس پر نکیر فرمائی، کیونکہ یہ صفت اللہ کی ہے، اور جس طرح اللہ کی ذات میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے، اسی طرح اس کی صفات میں شریک کرنا بھی شرک ہے، اللہ کی قدرت میں، اس کے علم میں، اور اس کی جو دوسری صفات ہیں، اگر ان میں کسی کو شریک کیا جا رہا ہے، تو یہ بھی شرک ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے اس شعر پر نکیر کی اور فرمایا؛ یہ مت کہو۔

مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے عالم الغیب ہونے پر نکیر کی، اس سے ان لوگوں کا دعوی باطل ہو گیا جو آپ ﷺ کو عالم الغیب ٹھہراتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کل کی سب باتیں جانتے تھے، ظاہر ہے آپ ﷺ نے اس پر خود نکیر فرمائی، اور یہ بخاری شریف کی صحیح روایت ہے، اور اسی قبیل کی دسیوں صحیح روایتیں ہیں، جن میں آپ ﷺ نے ان جیسی باتوں پر سخت نکیر فرمائی ہے، سخت برہمی ظاہر کی ہے، اس لیے اس سلسلہ میں بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

انکار منکر

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر شعر شرکیہ ہے تو اس پر نکیر کی جائے گی اور اس کی اصلاح کی جائے گی، اس زمانہ میں بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ شعر ہے اور شعر میں بہت سی وہ چیزیں جائز ہیں جو عام نثر میں جائز نہیں ہے، درحقیقت یہ بھی

شیطان کا بہکا وا ہے، ارشاد الٰہی ہے؛

﴿وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ﴾ (الشعراء: ٢٢٤)

(اور شاعروں کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ ہی لگتے ہیں)

یہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں شاعری کی دنیا الگ ہے، وہاں وہ جائز ہے جو عام حالات میں جائز نہیں ہے، حالانکہ شاعروں کی شریعت الگ نہیں ہے، جو شریعت تمام لوگوں کی ہے وہی شریعت شاعروں کی بھی ہے، لہٰذا اگر کوئی شعر خلاف عقیدہ ہے یا خلاف فطرت ہے یا شریعت کے خلاف ہے، تو خواہ شعر ہو یا نثر ہو، جو غلط ہے وہ غلط ہے، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ شعراء کے لیے وہ جائز ہے جو دوسروں کے لیے نہیں ہے، یہ الفاظ کے استعمال کے بارے میں ہے، بعض جگہ ضرورت شعری کی بنیاد پر شعراء الفاظ کے اندر بعض تبدیلیاں کر لیتے ہیں، یہ ٹھیک ہے، لیکن شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، وہ شاعر ہو یا عالم ہو، یہ اجازت اللہ کے کسی بڑے ولی یا علامہ وقت یا امام وقت کو بھی نہیں ہے، لہٰذا ظاہر ہے شاعر کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ شرکیہ اشعار کہے۔

حساس مقام

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ نعتوں میں جو اشعار کہے جاتے ہیں، ان میں بہت تجاوز پیدا ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت نازک فن ہے، اگر ذرا کمی ہوگئی تو کفر اور ذرا زیادتی ہوگئی تو شرک، اللہ کے رسول ﷺ کی ذات اقدس کے بارے میں جو عقیدہ ہونا چاہیے، اور جو محبت واحترام ہونا چاہیے، جو عظمت ہونی چاہیے، اگر اس کے اندر ذرا سی کمی ہوگئی تو کفر ہو جائے گا، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا اللہ کے رسول ﷺ کو جس طرح ماننا چاہیے اس طرح نہیں مان رہا ہے، اور اگر نہیں مان رہا ہے تو کفر ہے، اور اگر آپ ﷺ کی شان میں ذرا بھی اضافہ ہو گیا تو گویا اس نے خدائی میں شریک کر دیا لہٰذا یہ شرک ہو گیا، غرض کہ سب سے زیادہ جو نازک صنف ہے وہ نعتیہ شعر کی ہے، اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا معاملہ بہت بلند ہے، آپ جتنا چاہیے بڑھاتے

چلے جایئے، اس میں کوئی حدود نہیں ہیں، آپ جو چاہیں اللہ کے بارے میں کہتے چلے جائیں، اس کی عظمت کا اظہار کرتے چلے جائیں، وہ خدا ہے، وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن آپ ﷺ کے بارے میں اگر زیادتی کی جائے گی تو یہ شرک ہو جائے گا، اور اللہ کی صفات میں آپ ﷺ کو شریک کر دیا جائے گا تو یہ جائز نہیں ہے، اور اس کا نقصان یہ ہوگا کہ جب شرک ہوگا تو سارے اعمال حبط ہو جائیں گے، اگر شان اقدس میں کمی کر دی جائے گی اور آپ کی شان میں گستاخی حبط اعمال کا ذریعہ بنے گی، قرآن مجید کے اندر صاف کہہ دیا گیا ہے کہ اپنی آواز کو حضور ﷺ کی آواز پر اونچا مت کرو، اس کا ڈر ہے کہ تمہارے اعمال کہیں حبط نہ ہو جائیں، اس لیے کہ اگر حضور ﷺ کی آواز سے بلند آواز ہوگی تو یہ گستاخی ہے اور اس کے نتیجہ میں کفر کا اندیشہ ہے اور کفر کے نتیجہ میں حبط اعمال ہوتا ہے، معلوم ہوا آپ ﷺ کے بارے میں یہ بڑا نازک مسئلہ ہے، اگر زیادتی ہو رہی ہے تو شرک کا اندیشہ ہے، اور کمی ہو رہی ہے تو کفر کا اندیشہ ہے، اس لیے اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، اور اس سے بات نہیں بنے گی کہ آسانی کے ساتھ کہہ دیا جائے کہ شاعروں کی دنیا الگ ہے، اگر شاعروں کی دنیا الگ ہے تو پھر اس سے مراد وہ شعراء ہیں جن کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالشُّعَرَاء يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ﴾ (الشعراء: ٢٢٤)

(اور شاعروں کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ ہی لگتے ہیں)

یعنی یہ ایسے شعراء کے پیچھے وہ لوگ لگتے ہیں جو کج لوگ ہیں، جن کے دماغوں میں ٹیڑھ ہیں، وہ جو کہہ دیں اس کو صحیح مانتے ہیں، لیکن جو اہل حق ہیں، اور جو بات کو جانتے ہیں، اور عقیدہ کو صحیح طریقہ پر سمجھتے ہیں، وہ کبھی بھی غلط بات کے پیچھے نہیں چلتے، اور اس کی اتباع نہیں کرتے، وہ ہمیشہ غلط کو غلط کہتے ہیں، اور جو بات صحیح ہوتی ہے، اس کے پیچھے چلتے ہیں، اس لیے اس کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی

”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِنَّمَا أَنَا عَبْدُهٗ، فَقُوْلُوْا: عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ“(۱)

(حضرت عبداللہ بن عباس حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری حد سے بڑھی ہوئی تعریف نہ بیان کرنا جیسا کہ نصاریٰ نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کی غلط اور حد سے بڑھی مدح وتوصیف کی، میں تو اس کا بندہ ہوں، تو تم بھی (مجھے) اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو)

اس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت حکیمانہ بات فرمائی ہے، اور امت کو اس کی طرف متوجہ کیا ہے جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛ جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے ساتھ سلوک کیا اور ان کو خدا کا بیٹا بنا دیا، میرے ساتھ تم لوگ ایسا مت کرنا، مجھے تم اس طرح سے آگے مت بڑھا دینا، جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کے ساتھ کیا، میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ کا رسول ہوں، تو تم مجھے کہنا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں

(۱)البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللّٰہ﴿واذکر فی الکتاب﴾: ۳٤٤٥

اور اس کا رسول ہوں، یہ بات آپ ﷺ نے صاف صاف اس لیے فرمادی، کیونکہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ جس طرح گذشتہ امتوں نے اپنے نبیوں کے ساتھ کیا ہے، اس امت کے افراد بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے ساتھ احترام وعظمت میں غلو کریں اور اس کے نتیجہ میں وہ خدائی کا درجہ دے دیں۔

موجودہ دور کا المیہ

افسوس کی بات ہے کہ آج یہ صورت حال ہمارے سامنے ہے، امت میں ایک بڑا طبقہ ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں فرق نہیں کر پاتا، وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہے کہ جو عقیدہ گویا کہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو مشرکانہ عقیدہ ہے، جو تصورات اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں ہیں، وہی حضور ﷺ کے بارے میں بھی ہیں، اوپر گذر چکا ہے کہ اس حد تک بات پہنچ گئی ہے کہ وہ لوگ یہاں تک کہہ جاتے ہیں اپنے اشعار میں کہ اللہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا ہے اور اس نے محمد ﷺ کو بٹھادیا، اب جو ہوگا محمد ﷺ سے ہوگا، اللہ تعالیٰ فارغ ہوگیا، اور ایسے لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہمیں جو لینا ہے وہ لے لیں گے محمد سے، ہمیں کیا واسطہ کیا کسی دوسرے سے، اور اللہ سے ہمیں کیا لینا، ہم کو جو لینا ہے وہ محمد ﷺ سے لے لیں گے، ظاہر ہے یہ کھلا شرک ہے، اس کے آگے شرک کی کون سی قسم ہوگی جس میں یہ کہا جائے کہ معاذ اللہ! خدا تو معطل ہوگیا اور اپنا سب کچھ اللہ کے رسول ﷺ سے لے لیا جائے گا، آپ ﷺ قاضی الحاجات ہیں، مشکل کشا ہیں، حاجت روا ہیں، اگر یہ تصور کرلیا جائے گا تو آخر شرک کی کون سی قسم بچے گی؟ اس لیے جو واقعات پیش آنے والے تھے، ان میں بہت سی باتوں پر آپ ﷺ نے امت کو متوجہ فرمایا اور یقینی بات ہے کہ اللہ نے آپ ﷺ کے قلب اطہر میں یہ باتیں ڈالیں، جن کی بنیاد پر آپ ﷺ نے امت کو متوجہ فرمایا، امت کے ایسے متعدد امراض ہیں جن کے بارے میں آپ ﷺ نے صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا، ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”ما الفقر أخشى عليكم ولكن أخشى عليكم أن تبسط الدنيا عليكم كما بسطت على من كان قبلكم“(۱)

(مجھے تمہارے اوپر فقر و فاقہ کا ڈر نہیں ہے، اور لیکن مجھے ڈر ہے کہ تمہارے لیے دنیا اسی طرح نہ کھول دی جائے جس طرح تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ ہوا)

جس طرح اس حدیث میں آپ ﷺ نے صاف صاف فرمایا کہ مجھے فقر کا ڈر نہیں مجھے دنیا کا ڈر ہے، اسی طرح یہاں مذکورہ حدیث میں یہ فرمایا کہ مجھے اس طرح سے اونچا مت اٹھانا جیسے عیسائیوں نے عیسی بن مریم کے ساتھ کیا، میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں، یہ اس لیے فرمایا کہ امت میں ایسے لوگ پیدا ہونے والے تھے اور آج ہمارے سامنے ایسے لوگ ہیں جو نبی ﷺ کے متعلق مشرکانہ عقیدہ رکھتے ہیں، اور صاف کہتے ہیں کہ سارے کام بنانے والی ذات محمد ﷺ کی ہے، اب اللہ تبارک وتعالیٰ فارغ ہوگیا، اب سب کچھ آپ کے حوالہ ہوگیا، بلکہ بعض بعض یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ وہ خدا ہی ہیں، گویا اللہ کے رسول ﷺ کے جسد اطہر میں اللہ تبارک وتعالیٰ حلول کرگیا، یاد رہے یہ خالص ملحدانہ، کافرانہ، مشرکانہ عقائد ہیں جو امت میں پیدا ہورہے ہیں، آپ ﷺ نے ایسے عقائد پر سخت نکیر فرمائی ہے اور ایسے دسیوں واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں کہ توحید کے سلسلہ میں آپ ﷺ کو ادنی مداہنت بھی گوارا نہ تھی، آپ کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی تھی، جب آپ ایسی کوئی بات سنتے تھے تو برداشت نہیں ہوتا تھا، اس لیے ان مشرکانہ باتوں سے امت کو بچنا بہت ضروری ہے، اور اس کی تبلیغ ودعوت بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ہمارا صحیح عقیدہ کیا ہونا چاہیے، آج عام طور پر جو مواعظ ہوتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، ان میں عقیدہ کی بات بہت کم آتی ہے، حالانکہ اس کی ضرورت ہے، اس لیے کہ عقیدہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد ہے، اگر ہمارا عقیدہ صحیح نہیں ہے تو کوئی بھی عمل اللہ کے یہاں قبول نہیں

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق: ٧٦١٤

ہوگا، آپ نے صاف کہا؛ میں اللہ کا بندہ ہوں، تو کہو میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں، اور یہی آپ کا کمال ہے۔

مقام بلند کا راز

کمال عبدیت ہی آپ ﷺ کا مقام بلند ہے، اسی صفت کے نتیجہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے، اور معراج کے موقع پر اللہ ہی نے ''عبد'' کا لفظ آپ کے لیے استعمال فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ چیز سب سے زیادہ پسند ہے، جو عبدیت میں جتنا زیادہ کامل ہوگا وہ اتنا ہی اللہ کا محبوب ہوگا، اور آپ ﷺ عبدیت کاملہ کا آخری مظہر ہیں، اس کے بعد تصور نہیں ہوسکتا تو آپ ﷺ اللہ کے سب سے بڑے محبوب پیغمبر ہیں، کوئی بھی آپ ﷺ کے مقام تک کیا اس کے قریب بھی پہنچنا کسی کے لیے آسان نہیں ہے، اور آپ کو جو مقام رفیع ملا ہے وہ اسی عبدیت کامل کا نتیجہ ہے، لہٰذا اگر ہم اس کے خلاف کہہ رہے ہیں تو آپ کی شان اقدس میں توہین کر رہے ہیں، جو آپ کا مقام ہے، ہم اس کے خلاف کہہ رہے ہیں، اس لیے اس میں بہت احتیاط اور فہم کی ضرورت ہے۔

عبداورغلام کافرق

”عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَقُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ: عَبْدِیْ وَ أَمَتِیْ، كُلُّكُمْ عَبِيْدُ اللّٰهِ، وَكُلُّ نِسَائِكُمْ إِمَاءُ اللّٰهِ، وَلَكِنْ لِيَقُلْ: غُلَامِیْ وَجَارِيَتِیْ وَفَتَايَ وَفَتَاتِیْ، وَلَا يَقُلِ الْعَبْدُ: رَبِّیْ، وَلِيَقُلْ: سَيِّدِیْ وَ مَوْلَايَ، وَفِیْ رِوَايَةٍ: لَا يَقُلِ الْعَبْدُ لِسَيِّدِهٖ: مَوْلَايَ، فَإِنَّ مَوْلَاكُمُ اللّٰهُ“(۱)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: تم میں کوئی شخص ہرگز نہ کہے میری بندی، (اس لیے کہ) تم سب اللہ کے بندے ہو، اورتمہاری سب عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ہیں، لیکن چاہیے کہ وہ یوں کہیں میرا غلام، میری باندی، میرے نوجوان مرد، اورمیری نوجوان عورت، (میرے لڑکے، میری لڑکی) اورغلام (اپنے آقا کو) میرارب نہ کہے، اس کو چاہیے وہ یوں کہے میرے آقااورمیرے مولا اورایک روایت میں ہے کہ غلام مولیٰ بھی نہ کہے، اس لیے کہ تمہارامولااللہ ہے)

اس حدیث میں یہ بات صاف کردی گئی کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے غلام اور اپنی باندی کو”عبدی“اور ”أمتی “نہ کہے،”عبد“ کالفظ اللہ کے بندے کے لیے ہے، اوراس کے اندرعبدیت اور بندگی کامفہوم ہے، یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے،

(۱)مسلم، کتاب الألفاظ من الأدب وغيرها، باب حكم اطلاق لفظة العبد: ۲۲٤۹

لہٰذا اپنے غلام کو کوئی "عبدی" یا "أمتی" نہ کہے، سب اللہ کے بندے ہیں، اور ساری عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں، لہٰذا "غلامی" کہیں، "جاریتی" کہیں، "فتاي" کہیں، "فتاتی" کہیں، یعنی میرا نوجوان یا جیسے اردو اور عربی میں غلام کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو غلام کا لفظ استعمال کرلیا جائے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن "عبد" کے لفظ میں احتیاط کرنی چاہیے۔

عربی الفاظ کی باریکی

اسی طرح حدیث شریف میں فرمایا: "ربی" نہ کہے، کیونکہ سب کا رب اللہ ہے، البتہ "سیدی" "مولاي" کہنے میں حرج نہیں ہے، لیکن اگر کوئی "ربی" کہہ رہا ہے تو یہ لفظ اللہ کے لیے خاص ہے، رب صرف اللہ کی ذات ہے کوئی دوسرا رب نہیں ہے، اس لیے الفاظ کے استعمال میں بھی اس کا دھیان ہونا چاہیے کہ اس کا تجاوز نہ ہو، بعض روایتوں میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ "مولاي" بھی نہ کہا جائے، سب کا مولا اللہ ہے، لیکن بہرحال اس میں توسع اختیار کیا گیا ہے کہ "مولی" کا لفظ چونکہ ذو معانی ہے، اس کے اور بھی بہت سے معانی ہیں، "مولی" دوست، محبوب، آقا کے معنی میں بھی آتا ہے، اس لیے "مولی" کا لفظ بہرحال درست ہے، اگر اور دوسری روایتوں کو پیش نظر رکھا جائے، لیکن "رب" کا استعمال کہیں سے بھی درست نہیں ہے، اس لیے کہ رب صرف اللہ کی ذات ہے اور کسی کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا ہے، اس لیے الفاظ کے استعمال میں بھی دھیان رکھنا چاہیے، اس سے بات صاف ہوگئی کہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ "نحن عباد محمد" (ہم محمد کے بندے ہیں) تو گویا اس حدیث میں آپ ﷺ نے خود منع فرمادیا، کیونکہ آپ ﷺ خود فرمارہے ہیں کوئی یہ نہ کہے کہ وہ فلاں کا بندہ ہے، یا میں فلاں کا بندہ ہوں، بلکہ سب اللہ کے بندے ہیں، کوئی کسی کا بندہ نہیں ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ وہ غلام ہو، یا وہ اس کا دست نگر ہو، اور اس طرح کا کوئی تعلق یا رشتہ ہو جس کو اظہار کے طور پر کوئی بھی لفظ استعمال کرے، لیکن اپنے آپ کو وہ کسی اور کا

"عبـــد" کہے یہ مناسب نہیں ہے، اردو میں غلام کا لفظ کسی درجہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے، اگر چہ اس میں بھی احتیاط ہی بہتر ہے، لیکن عربی میں "عبـــد" کا جو لفظ ہے، اس میں بندگی کا خاص مفہوم ہے، اس میں عبادت کا مفہوم شامل ہے، "عبـد" عبادت ہی سے نکلا ہے، "عبـد" میں عبادت یعنی بندگی کا پہلو ہے، اور ظاہر ہے کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہے، کسی دوسرے کے لیے عبادت و بندگی نہیں ہے، اس لیے ایسے الفاظ کے استعمال میں اس بات کا خاص طور پر دھیان رکھنا چاہیے۔

قسم کیسے کھائیں؟

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَلَا إِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ مَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْ لِيَصْمُتْ“(۱)

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ نے تم کو باپ دادا کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، جس کو قسم کھانا ہو وہ اللہ کی قسم کھائے، ورنہ خاموش رہے)

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے کہ تم اپنے باپ دادا کی قسمیں کھاؤ، اگر کسی کو قسم کھانا ہے تو اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی دوسری چیز کی قسم کھانا حرام ہے، یہاں تک کہ بعض علماء نے اس کو شرکیہ عمل قرار دیا ہے، اس لیے کہ جس کی قسم کھائی جاتی ہے، اس کی بڑائی ذہنوں میں ہوتی ہے، اور بڑائی بھی اس انداز سے ذہنوں میں ہوتی ہے جو بڑائی گویا کہ اللہ تعالیٰ کے قریب پہنچتی ہے، تو ظاہر ہے ایسی بڑائی کسی کو زیبا نہیں، جو خدا کی بڑائی ہے وہ خدا کے لیے ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوسکتا، اگر ذرا بھی کسی کو قریب کیا جارہا ہے تو یہ شرک کی بات ہے، اسی لیے جب آدمی کسی کی قسم کھاتا ہے، تو اسی وقت کھاتا ہے جب اس کی عظمت ذہنوں میں ہوتی ہے، لہٰذا بندہ کے لیے جائز نہیں کہ وہ اللہ اور اس کی ذات وصفات کے علاوہ کسی دوسری چیز کی قسم کھائے، البتہ اللہ کی قسم کھائی جاسکتی ہے، اور اس کی ذات وصفات کی قسم کھائی جاسکتی ہے، باقی کسی چیز کی قسم کھانا جائز نہیں ہے، اور یہ ایک طرح کا مشرکانہ عمل ہے، ظاہر ہے اس سے شرک نہیں ہوجائے گا، لیکن یہ ایک مشرکانہ عمل ہے، اس لیے کہ اس میں عظمت کے اندر غلو

(۱)صحیح البخاری، کتاب الأیمان والنذور، باب لا تحلفوا بآبائکم: ٦٦٤٦

ہے، اور بڑائی میں ایک طرح کی زیادتی ہورہی ہے، جو بڑائی اللہ کے لیے ہے وہ آدمی دوسرے کے لیے قرار دے رہا ہے، اس لیے یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ بات شرک کے قریب پہنچ جائے گی، اس لیے اس سلسلہ میں احتیاط ہونی چاہیے۔

اللہ اور بندہ کی قسم میں فرق

اللہ تعالیٰ کی ذات بلند ہے، اس نے مختلف چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں، اس نے اپنی مخلوقات کی قسمیں کھائی ہیں، پھلوں کی قسمیں کھائی ہیں، زمانہ کی بھی قسم کھائی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ جو قسم کھاتا ہے وہ کسی چیز کی اہمیت کو بتانے کے لیے کھاتا ہے، البتہ بندہ کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوسری چیز کی قسم کھائے، اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ آپ ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ (الحجر: ۷۲)

(آپ کی جان کی قسم! وہ تو اپنے نشے میں بالکل ہی دُھت ہورہے تھے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی حیات طیبہ کی قسم کھائی ہے، اس سے آپ کے مقام رفیع کی طرف بھی اندازہ ہوتا ہے، لیکن کسی دوسرے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی بھی چیز کی قسم کھائے، اس لیے کہ اس میں شرک کا پہلو شامل ہے، لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے، اس میں بہت لوگ بے احتیاط ہوتے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں، کبھی باپ کی قسم، کبھی ماں کی قسم، کبھی فلاں چیز کی قسم، آپ نے ان تمام چیزوں سے منع کیا، چونکہ باپ کی قسم کا رواج پہلے بھی تھا، اس لیے اس کی صراحت بھی کردی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے کہ تم اپنے باپ کی قسمیں کھاؤ، جس کو قسم کھانا ہو اللہ کی قسم کھائے، ورنہ خاموش رہے۔

عام حالات میں قسم سے بچنا چاہیے، قسم کوئی بہت اچھی چیز نہیں ہے، اگر کبھی بہت شدید ضرورت ہو تو قسم کھالے، لیکن بار بار اپنی بات کو مؤکد کرنے کے لیے قسمیں کھانا، یہ گویا اللہ تعالیٰ کی شان عالی کے لیے مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس میں بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے اللہ کا حوالہ دیا جائے گا، اور یہ مناسب نہیں ہے، اس میں احتیاط کرنی چاہیے، اس طرح بار بار آدمی قسمیں نہ کھائے۔

اتباع سنت کا جذبہ

”عَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِيعَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ -يَعْنِي الْأَسْوَدَ- وَيَقُولُ: إِنِّي لَأَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَلَوْ لَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ“(۱)

(حضرت عابس بن ربیعہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا حجر اسود چوم رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، اگر میں رسول اللہ ﷺ کو چومتے نہ دیکھتا تو میں بھی نہ چومتا)

حضرت عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے فرمارہے ہیں؛ مجھے معلوم ہے تم پتھر ہو، تمہارے اندر نہ نقصان پہنچانے کی صلاحیت ہے، اور نہ فائدہ پہنچانے کی صلاحیت ہے، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا ہوتا کہ وہ تمہیں چوم رہے ہیں تو میں بھی تمہیں نہ چومتا۔

اصل قبلہ

اس عمل سے حضرت عمرؓ عقیدہ صاف کر رہے ہیں، تاکہ بات واضح ہو جائے کہ حجر اسود کا جو بوسہ لیا جاتا ہے وہ ایک سنت کا اتباع ہے، چونکہ آپ ﷺ نے یہ عمل کیا ہے اس لیے ہم بھی آپ ﷺ کی اتباع میں یہ عمل کرتے ہیں، لہٰذا اس میں یہ عقیدہ

(۱)صحيح البخاری، كتاب الحج، باب تقبيل الحجر الأسود: ۱٦۱۰

نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ایسا مقدس پتھر ہے جس سے ہمارا کچھ کام بن جائے گا، اور اس سے ہمیں فائدہ پہنچ جائے گا، خدانخواستہ اگر کسی آدمی کا یہ عقیدہ ہے تو مشرکانہ عقیدہ ہے، چاہے وہ حجر اسود کے بارے میں بھی یہ عقیدہ رکھتا ہے، یا بیت اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ ہو کہ بیت اللہ ہمارا کام بنائے گا، وہ اللہ کا گھر ہے، لیکن وہ جو ہمارے سامنے چیز نظر آرہی ہے، جو کہ اللہ کا گھر ہے، ہم جو اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، تو اس بیت اللہ کو سجدہ نہیں کرتے، بیت اللہ کو رکوع نہیں کرتے، بلکہ ہم درحقیقت اللہ کو رکوع کرتے ہیں، ہم اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، وہ صرف ایک طرح کا مظہر ہے، اس کو ایک علامت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے طے فرمایا ہے کہ اس کی طرف رخ کیا جائے، اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ۔

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

گویا وہ اصل قبلہ نہیں ہے، قبلہ اللہ کی ذات ہے، البتہ بیت اللہ قبلہ نما ہے، یعنی اس کو قبلہ کی طرح بنایا گیا ہے، لہٰذا ہمیں اس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھنی ہیں، دعائیں مانگنی ہیں، لیکن ہمیں دعا بیت اللہ سے نہیں مانگنی ہے، ہمیں نماز میں بیت اللہ کو سجدہ نہیں کرنا ہے، رکوع بیت اللہ کو نہیں کرنا ہے، ہاتھ باندھ کر ہم بیت اللہ کے سامنے نہیں کھڑے ہیں، بلکہ ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہیں، ہم اللہ کے لیے سجدہ کر رہے ہیں، ہم اللہ کے لیے رکوع کر رہے ہیں۔

اس بات کو ہمیشہ واضح رکھنا چاہیے تاکہ آدمی کا عقیدہ مضبوط رہے، بیت اللہ ہمیں فائدہ نہیں پہنچائے گا، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فائدہ پہنچائے گا، اسی طرح حجر اسود اس کا ایک حصہ ہے، وہ جنت کا پتھر ہے، مقدس پتھر ہے، اور جنت سے آیا ہے، اس لیے اونچی نسبت رکھتا ہے، لیکن یہ پتھر نہ ہمیں فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ نقصان، بس ہم اتباع سنت کے لیے اس کی تقبیل کرتے ہیں، مذکورہ حدیث میں حضرت عمرؓ نے اس کی وضاحت فرمادی، تاکہ ہر ایک کے سامنے بات صاف ہو جائے۔

نافع وضار کون؟

ہمارے بعض غیر مسلم بھائیوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے، اور جب ہم بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بیت اللہ کو سجدہ کر رہے ہیں نہ کہ اللہ کو، یا حجر اسود کو جو چومتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ گویا مسلمان حجر اسود کو نافع وضار سمجھتے ہیں، چنانچہ اس حدیث کے تناظر میں اگر غور کیا جائے تو یہی عقیدہ صاف کر دیا گیا ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے، نافع وضار صرف اللہ کی ذات ہے، کسی کے بس میں کچھ نہیں، یہ سب اعمال اللہ کے رسول ﷺ نے کیے ہیں، اسی لیے ہم یہ اعمال سنت سمجھ کر کرتے ہیں، لیکن ہم ان چیزوں کو نافع وضار نہیں سمجھتے، نافع وضار صرف اللہ کی ذات ہے اور آپ ﷺ نے جتنا اس میں کیا ہے ہم اتنا ہی کریں گے۔

تجاوز کا نتیجہ

اب کوئی حد سے آگے بڑھ جائے اور یہ کہے کہ جب ہم بیت اللہ کو سجدہ کر رہے ہیں تو کیوں نہ روضۂ اقدس کو سجدہ کریں، اور کیوں نہ فلاں فلاں قبروں کو سجدہ کریں، بس یہاں سے بات صاف ہو جائے گی کہ جتنا آپ ﷺ نے کیا اس کو سنت سمجھ کر کرنا ہے، اگر ان چیزوں میں ذرا سا بھی کوئی تجاوز کرے گا تو وہ شرک میں مبتلا ہو جائے گا، نص سے ثابت ہے کہ بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی گئی، لہٰذا ہم بھی اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے، لیکن اب کوئی یہ کہے کہ روضہ اقدس کی بڑی قیمت ہے، علماء نے یہاں تک لکھا بھی ہے کہ آپ ﷺ جس جگہ پر تشریف فرما ہیں، اور وہ مٹی جو آپ ﷺ کے جسد اطہر سے مس ہو رہی ہے، وہ بیت اللہ سے زیادہ افضل ہے، لہٰذا ہم اس کو بھی سجدہ کریں گے، تو یاد رہے آپ ﷺ نے ہم کو جو سکھایا ہے، اگر ہم اس کے خلاف کرتے ہیں تو یہ آپ ﷺ کی بے احترامی ہے، آپ ﷺ کے احترام و محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ نے جو فرمایا اور آپ نے جس چیز کی دعوت دی، اسی کے

مطابق عمل کیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو، اور قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا، بس ہمیں یہ عمل کرنا ہے، اگر ہم اس میں اپنی رائے سے چلیں گے، اپنی تجویز کو داخل کریں گے تو ظاہر ہے شرک میں مبتلا ہوں گے، بدعات میں مبتلا ہوں گے، اور یہی امت کے بہت سے لوگوں سے غلطی ہوئی ہے، جب تک شریعت سے پوری طرح آدمی چمٹ کر نہیں رہے گا، جس کے متعلق الفاظ حدیث یہ ہیں:

"عضوا علیها بالنواجذ"(۱)

(اس کو دانتوں تلے مضبوطی سے پکڑ لو)

جب تک انسان شریعت کو دانتوں سے پکڑ کر نہیں رکھے گا تو ظاہر ہے کہ شیطان اپنا کام کرتا رہے گا، وہ آدمی کو شرک میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، اس کا سب سے بڑا ہتھکنڈا یہی ہے، یہ سب سے آسان کام ہے، کیونکہ دس کاموں سے پھیرنا مشکل ہے، اور اگر ایک کام میں مبتلا کر دو تو سارے کام خود بخود غارت ہو جائیں گے، اگر کسی کو شرک میں مبتلا کر دو، تو جتنی نیکیاں ہیں، عبادتیں ہیں اور ثواب کے کام ہیں، وہ سب بے کار ہو جائیں گے، کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں رہے گی، اس لیے جتنا آپ ﷺ نے فرمایا ہے اتنا ہی کرنا ہے۔

عقیدۂ توحید کا تقاضا

عقیدۂ توحید سب سے بنیادی عقیدہ ہے، اس کو مضبوطی سے تھامنا ہے، اللہ کو ایک سمجھنا ہے، اور ازلی وابدی سمجھنا ہے، جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا، جب کچھ نہیں ہوگا تو اللہ ہوگا، اس کی ذات باقی ہے، اس کے علاوہ سب فانی ہے، یہ عقیدہ مضبوط ہونا چاہیے، اس کی صفات پر یقین ہونا چاہیے، ان میں کسی کو شریک نہیں کرنا ہے، یہ دراصل توحید کا مضبوط عقیدہ ہے، اس کو راسخ کرنا چاہیے، اور بزرگوں کے بارے

(۱)الترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع: ۲۸۹۱

میں چاہے وہ زندہ ہوں یا مردہ، ادنیٰ بھی یہ تصور قائم کرنا کہ وہ ہمارا کام بنادیں گے یا وہاں جانے سے ہمارا کام بن جائے گا، یہ بھی مشرکانہ عقیدہ ہے، اگر آپ وہاں جائیں گے اور ان سے دعا کے لیے کہیں گے تو یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں سنتا ہے، اس لیے کہ وہ ''عبد'' ہیں، وہ اللہ کے بندے ہیں، یعنی وہ خاک پر اپنی پیشانی کو رکھ کر اللہ کے سامنے تضرع کرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں اور اپنی ناک کو خاک پر رگڑتے ہیں، خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں، اور یہی ان کا کمال بندگی ہے، اور اسی کمال بندگی سے اللہ تعالیٰ ان کو اپنی ذات سے قریب کرتا ہے، اور ان کی دعائیں سنتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص کسی بزرگ کے پاس جا کر دعا کی درخواست کرتا ہے تو یہ مسنون عمل ہے، خود آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے یہ بات کہی تھی:

"یا أخي لا تنسنا في دعائك"(۱)

حدیث میں فرمایا: بھیا ہمیں بھی اپنی دعا میں یاد رکھنا، اور یہاں تک فرمایا تھا کہ اگر تمہیں اویس قرنی ملیں تو ان سے دعا کرانا، معلوم ہوا دعا کرانا اور اس کی درخواست کرنا مسنون ہے، اس میں حرج نہیں بلکہ بہتر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ وہاں جانے سے کام بن جائے گا، ان کے کہنے سے کام ہو جائے گا یہ مشرکانہ عقیدہ ہے، کسی کے کہنے سے کام نہیں ہوتا، کوئی اللہ سے کہتا نہیں ہے، بلکہ اللہ سے درخواست اور دعا کی جاتی ہے، کہنے کا حق کس کو ہے؟ کس کو مجال ہے کہ وہ اللہ کے سامنے جا کر کہے؟ کہتا وہ ہے جو ذرا بھی کچھ برابری رکھتا ہو، جو کوئی اس کے دربار میں جائے گا تو وہ اس کے سامنے درخواست کرے گا، اس سے دعا کرے گا، لہٰذا یہ سمجھنا کہ فلاں کہہ دیں گے تو کام ہو جائے گا، اور فلاں چاہ لیں گے تو کام ہو جائے گا، فلاں جگہ جائیں گے تو کام بن جائے گا بالکل غلط ہے، یاد رہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ فلاں زندہ بزرگ یا مردہ بزرگ کے پاس جانے یا ان کی قبر کو سجدہ کرنے یا ان کی خانقاہ جانے سے کام بن جائے گا تو یہ مشرکانہ عقیدہ ہے، اس کا توحید سے کوئی تعلق نہیں، صرف وہاں جانے سے کام نہیں ہوگا، آپ اولاً ان سے

---

(۱)سنن أبي داؤد، کتاب الوتر، باب الدعاء: ۱۵۰۰

دعا کرائیں گے، اللہ ان کی دعا سنے گا تو کام بنے گا اور اگر اللہ چاہے گا تو دعا سنے گا اور چاہے گا تو دعا نہیں سنے گا، اللہ کے رسول ﷺ جو سب سے بڑھ کر اللہ کے محبوب ہیں، ان کے بارے میں یہ صاف صاف کہہ دیا گیا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِيْ مَن يَشَاءُ﴾

(القصص: ٥٦)

(آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، ہاں اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)

آپ ﷺ کی دعا تھی، آپ ﷺ کی چاہت تھی اور انتہائی درجہ کی چاہت تھی کہ ابوطالب مسلمان ہو جائیں، لیکن اللہ کا حکم نہیں تھا اس لیے کہا گیا: آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، اور اللہ نے ابوطالب کو اسلام کی توفیق نہیں عطا فرمائی، گویا اس سے اللہ نے یہ دکھایا کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا، کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، لہٰذا سمجھ لینا چاہیے کہ کسی کے کہنے سے، کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ اللہ کے سامنے درخواست پیش کرتے ہیں، اور جو اللہ کے مقرب بندے ہیں، اللہ ان کی سنتا ہے، اس لیے ان سے دعا کی درخواست کرانا بہتر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ وہاں جانے سے کام ہو ہی جائے گا یہ مشرکانہ تصور ہے اور مشرکانہ بات ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

توحید کا تصور

آج ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے عقیدوں کو ٹٹولنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ہم میں جو صحیح العقیدہ لوگ سمجھے جاتے ہیں، گویا اپنے حلقہ کے لوگ سمجھے جاتے ہیں، ان کے اندر بھی یہ بات پیدا ہو جاتی ہے، اور بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں جگہ جائیں گے تو کام ہو جائے گا، فلاں بزرگ سے دعا کے لیے کہہ دیں گے تو کام ہو ہی جائے گا، واضح رہے کہ کام ایسے ہی نہیں جائے گا، بلکہ وہ اللہ والے دعا کریں گے پھر اللہ چاہے گا تو سنے گا اور نہیں چاہے گا تو نہیں سنے گا، باقی یقین تو آپ کو اپنی دعا پر بھی

رکھنا چاہیے، اور جتنا یقین ہوگا اتنا ہی اللہ سنتا بھی ہے، آپ یقین کے ساتھ دعا کیجئے تو انشاء اللہ اللہ کا حکم ہوگا اور چیز آپ کو ملے گی، تو یہ ایک الگ بات ہے کہ دعا یقین کے ساتھ کی جائے، لیکن اللہ کو کوئی مجبور سمجھ لے، اور کسی بزرگ یا کسی ولی کو سمجھے کہ بس وہ چاہیں گے تو گویا اللہ بے چارہ ہے اور وہ دے ہی دے گا، یہ مشرکانہ عقیدہ ہے، اللہ کی ذات بہت بلند ہے، وہ قادر مطلق ہے، سب خزانے اس کے پاس ہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس کے سامنے کسی کو دم مانے کا یارا نہیں، کون ہے جو اس کے سامنے سفارش کر سکے مگر اس کی اجازت سے، جو قیامت میں سفارشیں ہوں گی، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی جو شفاعت عظمی ہوگی، وہ بھی اللہ کی اجازت سے ہوگی۔

اعمال کی روح

حاصل بحث یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے عقیدہ کو مضبوط کرنا ہے، توحید کے عقیدہ کو خاص طور پر مضبوط اور خالص کرنا ہر ایمان والے کی ذمہ داری ہے، تاکہ ہمارے جتنے بھی کام ہیں وہ سب اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوں، اس لیے کہ تمام اعمال کی بنیاد عقیدہ پر ہے اور تمام عقیدوں کی بنیاد توحید کے عقیدہ پر ہے، اگر یہ عقیدہ پھسپھسا ہوا تو گویا ریت کا ڈھیر ہے، اس پر کتنی ہی اونچی عمارت بنایئے وہ ایک آندھی میں زمین بوس ہو جائے گی اور بالکل ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی، اسی طرح اگر عقیدۂ توحید کمزور ہے تو ہمارے کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں رہ جائے گی، کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد ریت کے ڈھیر پر ہے، اس لیے کہ اگر خدانخواستہ ہمارا عقیدہ پھسپھسا ہے تو پھر وہ ریت کا ڈھیر ہی ہے، اس لیے اس کو مضبوط کیا جائے اور اس کو خالص کیا جائے، یہ ہماری ایک بنیادی ذمہ داری ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین.